مسائلِ فقہ وفتاویٔ نجم

﴿مضامین/ فتاویٔ﴾

افضل العلماء

حضرت الحاج مولانا سید نجم الدین علیہ الرحمہ

(سابق صدر مجلس علمائے مہدویہ ہند)

زیر اہتمام

مہدویہ فاونڈیشن (امریکہ)

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : مسائلِ فقہ وفتاویٰ ءنجم (مضامین رفتاویٰ ء)
نام مولف : افضل العلماء حضرت مولانا سید نجم الدین علیہ الرحمہ
سابق صدر مجلس علمائے مہدویہ ہند
کمپیوٹر کتابت : SAN کمپیوٹر سنٹر' صوبیدار امیر علی خاں روڈ (نئی سڑک)
چنچل گوڑہ' حیدرآباد۔سیل نمبر 9959912642
تعداد اشاعت : 500
سن اشاعت : مئی 2013ء
قیمت : 100

ناشر
مہدویہ فاونڈیشن (امریکہ)

ملنے کے پتے

(۱) مہدویہ فاونڈیشن (امریکہ)
(۲) ادارۂ تنظیم مہدویہ' 16-8-806' نیو ملک پیٹ' حیدرآباد
(۳) SAN کمپیوٹر سنٹر' صوبیدار امیر علی خاں روڈ (نئی سڑک) چنچل گوڑہ' حیدرآباد
(۴) A To Z Stationary مرکزی انجمن مہدویہ چنچلگوڑہ حیدرآباد

﴿انتساب﴾

اُن عقیدت مندوں کے نام

جو ایک عرصہ دراز سے

افضل العلماء حضرت مولانا سید نجم الدین صاحبؒ

کے مضامین جو مسائلِ فقہ پر مختلف رسائل میں شائع ہوئے

ان کے مجموعہ کی اشاعت کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں۔

محترمہ سیدہ حسین بانو صاحبہ
(بنتِ افضل العلماء حضرت سید نجم الدین صاحب قبلہؒ)

نے
اپنے زوج

حضرت سید امیر الدین عرف روح اللہ میاں صاحب قبلہؒ

کے
ایصالِ ثواب کیلئے

اس کتاب کی اشاعت میں مالی تعاون کیا

اس کے لئے ادارہ ان کا مشکور ھے

فہرست مضامین

سلسلہ نشان	مضمون	صفحہ نمبر
1	پیش لفظ	6
2	فقیہہ زماں	9
3	عرض ناشر	11
4	رویائے خلیلؑ	12
5	تشہد اور انگشت شہادت	18
6	تکرارِ جماعت	22
7	نکاح غائبانہ	25
8	شرائط نکاح	36
9	بولا چالا معاف کرنا اور احکام شرع	67
10	فضائل یوم عاشورہ	72
11	زیارتِ قبور	78
12	عورت اور زیارت قبور	89
13	نمازِ قصر	94
14	نماز ودعائے استسقاء	99
15	فوٹو کا شرعی حکم	107
16	یورپ کا ذبیحہ	114
17	صدقۂ فطر	128
18	نصاب کا معیار سونا یا چاندی ہی کیوں	137

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حیدرآباد نے ایسی بہت سی شخصیتوں کو جنم دیا ہے جنہیں دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ اور متمدن ومہذب قوم کے نامور ہیروں کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے بلکہ دوسری قوموں کے مشاہیر کو ان کی عظمت کے سامنے سر نگوں بھی کیا جاسکتا ہے۔ ایسی عظیم شخصیتوں میں افضل العلماء حضرت مولانا سید نجم الدین علیہ الرحمہ بھی ہیں۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ ایسے لوگ ہماری ستائش وتعریف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی خدمت قوم وملّت کے لئے انجام دی اس کا صلہ وہ اپنے رب سے ضرور پا رہے ہیں۔ اس لئے کہ انکا عمل جس ذات کی رضا جوئی کے لئے تھا وہ ایسے خدمت گزاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ لیکن ہمیں اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر سوچنا چاہئے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور ہم نے ان حضرات سے کیا استفادہ کیا اور کہاں تک فیضیاب ہوئے ہیں۔ اور پھر تعجب بھی ہوتا ہے اور دکھ بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری نئی نسل ماضی کے ورثہ سے اپنا رشتہ بڑی تیزی سے منقطع کرتے چلی آرہی ہے۔ گوکہ اسلام شخصیت پرستی کا قائل نہیں ہے مگر وہ شخصیتوں کو گوشہ گمنامی میں پھینک دینے کا بھی ہرگز روادار نہیں ہے۔ قران میں اللہ کا ارشاد ہے کہ ''واعرفوا الھٰم فضلھم'' یعنی ان کی عظمت کا اعتراف کرو۔

حضرت مولانا سید نجم الدین علیہ الرحمہ کو ابتدائی عمر سے ہی علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علم باطنی کے حصول کی تڑپ تھی اور اس طلب وحق کے جذبہ میں آخری وقت تک بھی کمی نظر نہیں آئی۔ اپنے نانا حضرت علامۃ العصر مولانا سید نصرتؒ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ بحر العلوم علامہ شمسیؒ اور حضرت مولانا سید شہاب الدینؒ سے اکتسابِ فیض اور علوم ظاہری اور علم باطنی حاصل کیا۔

حضرت مولانا سید نجم الدین علیہ الرحمہ چودھویں صدی ہجری میں علم وعرفان کی شمع روشن کی اور حق وصداقت کا چراغ فروزاں کیا۔ آپ نے فقر وتوکل میں کبھی بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا اور ہمیشہ عفو اور درگذر سے کام لیا۔ اُلجھے ہوئے مسائل کو بصیرت سے سلجھایا۔ حضرت نے فکر ونظر کے جو زاویئے پیش کئے' علم وتحقیق کا جو ڈول ڈالا اور مہدویت کے علوم وافکار کی تعبیر کا جو اسلوبِ جدید حضرت نے اختیار کیا وہ قابلِ ستائش ہے۔ قوم آپ کے اس عظیم کارنامہ کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتی۔

حضرت مولانا سید نجم الدینؒ نے تعلیمات امامنا علیہ السلام کو جس ڈھنگ سے پیش کیا اور اس کی

تفہیم کے لئے جوطرز بیان اختیار کیا وہ ہماری تاریخ کا ایک نیا موڑ ہے جو ہر ایک کے لئے موزوں ہے۔ تبلیغی نقطہ نظر سے آپ کا یہ طرز بیاں کافی اہمیت رکھتا ہے۔حضرت کے زبردست علمی کارنامے آپ کے مضامین ہیں جو دائرۂ المصدق' نور حیات' نور ولایت اور دوسرے پرچوں میں شائع ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ کئی ایک رسائل وکتابیں ہیں جو آپ کی عین حیات ہی میں شائع ہوئی ہیں۔

''تنویر الابصار'' حضرت کی ایک معرکتہ الآراء تصنیف ہے۔قرآن پاک سے حضرت کی غیر معمولی دلچسپی کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔حضرت نے لوامع البیان (عربی) کا جوحصہ شائع ہوا تھا اس کا اردو ترجمہ ہاتھ پر لیا تھا۔اس کام کے مکمل ہونے کے لئے صرف تین یا چار صفحات باقی تھے' علالت شروع ہوگئی اور یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔اس کے علاوہ معرکتہ الآراء کتابیں ثبوت مہدی (احادیث کی روشنی میں)' مہدویت عین اسلام ہے اور کئی ایک کتابیں ورسائل ہیں جو سادہ طرزِ بیان سے قوم میں پسند کئے جاتے ہیں۔جہاں تک افتاء کا تعلق ہے اس بات میں آپ بلا شبہ ایک منفرد اور مثالی شخصیت تھے۔آپ نے تن تنہا اس فن میں کئی بیش بہا خدمات عالم اسلام کے لئے سرانجام دی ہیں۔اگر آپ کو بہت بڑے فقیہہ تھے' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔اس کے علاوہ عقل وفراست میں یکتا تھے۔تمام فقہی مسائل پر عبور حاصل تھا۔اور فہم حدیث میں خاص درک رکھتے تھے۔ حضرت فقہ اور حدیث کے سلسلہ میں قرآن حکیم ہی کے اصول کو اپنا رہنما قرار دیا۔کئی ایک فقہی مسائل کو حل کیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔غرض آپ کی ملّی ودینی خدمات ہر میدان میں ممتاز نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا سید نجم الدین علیہ الرحمہ پابندِ شریعت بزرگ تھے۔معرفت' توحید اور تحقیق میں کامل تھے۔اکثر ذکر اللہ میں رہا کرتے تھے اور مسجد میں ہی زیادہ وقت گزارتے تھے۔آپ کے اخلاقِ حسنہ کی بدولت ہر ایک بلا لحاظ عمر ومراتب آپ کے گرد جمع ہوتے تھے۔آپ کو دنیا سے کوئی رغبت نہ تھی اور ایک سچے تارک الدنیا تھے جو تارک الدنیا ہوتا ہے اس کو نہ کوئی تمنا ہوتی ہے اور نہ کوئی خواہش اس زاویہ کی نگاہ سے ہم جب حضرت کی سیرت مبارکہ کے اوراق کو پڑھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آپ کو نہ کوئی تمنا تھی اور نہ کوئی خواہش' جو ایک سچے تارک الدنیا ہونے کی علامت ہے۔حضرت کی گوناگوں صلاحیتوں اور قابلیتوں کے ساتھ ساتھ آپ کی فراست' حکمت' اخلاق نے آپ کو ہر ایک کے لئے دل آویز شخصیت بنادی تھی۔

حضرت مولانا سید نجم الدین علیہ الرحمہ ۲۲ر صفر المرام ۱۳۲۰ھ کو اس دنیائے فانی میں تشریف لائے۔حضرت نے ۱۳ سال کی کم عمر میں والد بزرگوار حضرت سید محمود صاحبؒ کے ہاتھ پر ترک دنیا فرمائی۔۲۲ر شوال المکرّم ۱۴۰۵ھ م ۱۱ر جولائی ۱۹۸۵ء کو ۸۵ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ فرمائے۔حظیرہ بندگی میاں

شاہ قاسم مجتہد گروہؒ مشیر آباد میں تالاب کے جنوبی سمت واقع چبوترے میں تدفین عمل میں آئی۔ جب تک حیات رہی علم وعمل، رشد وہدایت کے لئے خود کو قوم کے لئے وقف کردئے تھے۔ مسند ارشاد پر تقریباً ۶۵ سال جلوہ افروز رہے۔ دومرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی اور فراہ مبارک کا سفر ۱۹۶۴ میں کیا اور خاتم ولایت کی بارگاہ میں حاضری دی۔ تاحیات کل ہند مجلس علمائے مہدویہ ہند کی صدارت پر فائز رہے۔

ماہنامہ نور ولایت نے حضرت علیہ الرحمہ کے دینی ومذہبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ۱۵ر ستمبر ۱۹۸۵ء کا شمارہ شائع کیا تھا جس میں قوم کے دانشوروں نے مضامین کے ذریعہ اور شعراء نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ اس شمارہ کے اداریہ میں آپ کے مضامین اور فتوؤں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ جو قوم کے لئے ایک سرمایۂ علمی ثابت ہوگا اس کے علاوہ ماہنامہ نور ولایت نے آپ کے چند مضامین کا مجموعہ جولائی ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں شائع کیا تھا۔

الحمدللہ یہ خوش آئند بات ہے کہ مضامین بعنوانِ ''سفینہ نجم'' کے شائع کرنیکے بعد مہدویہ فانڈیشن (امریکہ) کو حضرت علیہ الرحمہ کے سرمایۂ علمی میں مسائلِ فقہ پر جو فتاوئے دئے گے تھے ان میں سے کچھ کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اس کتاب میں جملہ (۱۵) مضامین ہیں جو ماہنامہ نور حیات، نور ولایت، میں شائع ہوئے ہیں ان مضامین کو ''مسائلِ فقہ وفتاویٰ ءنجم'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ہر مسلۂ پر جامع اور مکمل افہام وتفہیم کے انداز میں نہایت دلنشین اور متاثر کن پیراہہ سے مسلۂ کا حل بتایا گیا ہے۔ ہر قاری کو آسانی سے بات سمجھ آجائیگی۔

خاص طور پر محترمہ اہلیہ حضرت ابوالفتح سید جلال الدین صاحب مرحوم، کا شکریہ ادا کرنا چاہونگا اس لئے کے بڑی محنت سے انہوں نے تمام مضامین کو جمع کر کے دیا اور ناسپاسی ہوگی اگر جناب شیخ چاند ساجد صاحب، جناب ابوالفیض سید احمد عابد صاحب اور جناب سید نور محمد نظامی صاحب سان کمپیوٹر سنٹر کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں تعاون فرمایا۔ رب قدیر جزائے خیر عطا فرمائے اُن تمام کو جو اس کتاب کی اشاعت کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسلام کے ہر شیدائی کو اس کے مطالعہ سے پیاس بجھانے اور تصدیق کا شرف پانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقیر مقصود علی خان غفرلہ

۲ر مئی ۲۰۱۳ء

جناب سید عظمت اللہ صاحب (شکاگو)

فقیہہِ زماں

حمد وثنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، حکمت وعلم کو پیدا کرنے والا ہے، زمین سے نکلنے والی، آسمان سے اُترنے والی، آسمان کی طرف چڑھنے والی ہر چیز اس کے علم میں ہے ۔ میں اقرار کرتا ہوں حضرت محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور اس کے بندے بھی ۔ میں تصدیق کرتا ہوں حضرت سید محمد جونپوری ہی خلیفتہ اللہ ومہدی موعودؑ ہیں ۔ ہزاروں درود وسلام ہوان خدائی بعثتوں پر

یہ میری خوش نصیبی اور سعادت ہے کہ نانا حضرت افضل العلماء حضرت مولانا سید نجم الدین صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کے فتوی پر مشتمل اس کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کروں ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک موقعہ پر حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا میں علیم ہوں اور علم والوں سے محبت کرتا ہوں ۔ یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کوئی مخصوص علم کی نشاندہی نہیں فرمائی ہے بلکہ وہ علم ہے جو بنی نوع انسان کو فائدہ پہونچائے ۔ جو بندوں کو اللہ سے قریب کرے ۔ حدیث شریف بھی ہے کہ جس کا اللہ تعالیٰ بھلا کرنا چاہتا ہے اسے دینی فقہیہ بنا دیتا ہے ۔ کون نہیں چاہے گا کہ اللہ اس کا بھلا نہ کرے ۔ خوش نصیب ہیں وہ بندگانِ خدا جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ فقہیہ بنانے کے لئے منتخب کر لیتا ہے ۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر دور میں بنی نوع انسان پر فقہیہ کا احسان رہا ہے، وہ زمانے کے بدلتے ہوئے نشیب وفراز کے باوجود شریعت کے محافظ بن کر خدمت کئے جاتے ہیں ۔ ایسے ہی فقیہوں میں ایک شخصیت افضل العلماء حضرت مولانا سید نجم الدین صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کی بھی ہے ۔ آپ کو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، احادیث، فرامین امامناؑ، اور فقہ ان تمام اُمور کا علم تھا ۔ سب سے اہم بات جو آپ کی شخصیت میں نمایاں تھی وہ یہ کہ دینی تمام علوم کے اقسام پر بھی کافی عبور حاصل تھا جس کا بین ثبوت یہ کتاب ہے ۔

حضرت مہدی موعودؑ نے قول عزیمت کو اختیار کرنے کا حکم دیا کیونکہ چاروں ائمہ کے اقوال میں ایک ہی قول عزیمت کے معیار پر ہوگا ۔ بقیہ تین اقوال رخصت پر ہونگے ۔ اسی وجہ سے مہدی موعودؑ نے قول

عزیمت کو اختیار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت مولانا سید نجم الدین صاحب قبلہؒ کے پیش نظر ہمیشہ یہ قول رہا۔ اس حکم کو ہم آپ کے فتوے میں بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ فقیہہ وہ ہوتا ہے جس کو تمام مسائل میں استنباط کا ملکہ ہو۔ الحمدللہ مولانا میں تقریباً وہ تمام علمی خوبیاں تھیں جو ایک فقیہہ کے لئے ضروری ہے۔ آپ کے فتوے اس زمانے میں دین کو استحکام عطا کئے اور شریعت وطریقت کی حفاظت کئے ہیں۔ نصف صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اہل علم آپ کے فتوؤں سے اکتساب حاصل کر رہے ہیں۔ ایک زمانے دراز سے چوطرف سے آوازیں اُٹھ رہی تھیں کہ تمام فتویٰ کو یکجا کر کے منظر عام پر لایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق عطا فرمائی اور خاتمینؐ کے فضل وکرم سے فتوؤں کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

آپ کے کئی ایک مضامین قومی علمی جرائد کی شان دوبالا کرتے رہے ہیں۔ بیسوں فقہی ودینی مسائل پر فتاوے شائع ہوتے رہے۔ پھر بعض اہم عنوانات پر جو معرکتہ الآراء مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان میں بطور خاص' شرائط نکاح' یوروپ کا ذبیحہ جیسے بلند پایہ مسائل فقہ کے ساتھ ''نصاب کا معیار سونا یا چاندی ہی کیوں'' اور ''صدقہ فطر'' قبولیت عامہ حاصل کر چکے ہیں۔

نانا حضرت افضل العلماٗ مولانا سید نجم الدین قبلہ کی حقیقت یہ ہے کہ تحریر کے بیسوں اسلوب انداز اور اقسام ہیں لیکن سیدھی سادھی دل نشین تحریر لکھنا ہر ایک قلم کار کے بس کی بات نہیں۔ یہاں محنت اور دیدہ ریزی کی ضرورت پڑتی ہے۔ دو اور دو چار کی طرح وہ سیدھی بات کو ایسے پرلطف سیدھے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ وہ ذہن سے چپک کر رہ جاتی ہے۔

غرض آپ کے فتاویٰ کثرت سے ہیں۔ گروہ مہدویہ میں نکاح کے وقت جو چار شرائط سنائی جاتی ہیں اس تعلق سے استفسار پر آپ نے مبسوط نہایت ہی فصیح وبلیغ فتویٰ ہاتھ سے لکھے ہوئے تقریباً ۴۵ صفحات پر دیا ہے۔ علاوہ ازیں رویت ہلال کے تعلق سے فتویٰ دے کر آپ نے کئی غلط فہمیاں دور کیں۔ جو اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اہل علم اور عوام الناس کو اس کتاب سے فیضیاب ہونے کی توفیق دے کیونکہ اس کتاب کے مسائل میں اسلام کی اصل روح پیش کرنے کی مولانا نے بڑی محنت وجانفشانی سے کوشش کی ہے۔

☆☆☆☆☆

عرض ناشر

زیرِ نظر کتاب ''مسائلِ فقہ وفتاویٔ نجم'' مولانا حضرت سید نجم الدین صاحب قبلہ افضل العلماءؒ کے فقہی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں کئی چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی شامل کردئے گئے ہیں اس لئے کہ حضرت کے کتابچے علمی اور تحقیقی کام کا ایسا حصہ ہے کہ قوم میں اتنی فصاحت وبلاغت کے ساتھ ان موضوعات پر کسی اور کا کام نہیں۔ اور ان مضامین رفتاوے کی سلاست وروانی اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کئی رسالوں میں چھپ چکے ہیں اور کئی کتابچہ کی شکل میں شائع ہوکر مقبول بھی ہوئے۔ اس میں مصنف اور مضامین کے تعلق سے کچھ زیادہ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مماثل ہے۔

مہدویہ فاونڈیشن کی روایت رہی ہے کہ ہمارے علمی ورثہ کا کسی نہ کسی طرح تحفظ کیا جائے اور اس کوشش میں کئی ایک کام اس سے پہلے بھی اللہ کے فضل وکرم سے پایۂ تکمیل کو پہنچے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے علاوہ بعض تحریرات جو دینی مضامین کی شکل میں حضرت سید نجم الدین صاحب افضل العلماء کا کام موجود ہے اور نور حیات' نورِ ولایت' اور المصدق میں شائع بھی ہوا تھا۔ ان کو بھی کتابی شکل دے کر ''سفینۂ نجم'' کے نام سے شائع کیا جا چکا ہے۔

ہم ان تمام حضرات کا جنہوں نے ان مواد کو اکھٹا کرنے اور اس کی اشاعت میں تعاون کیا جن میں حضرت مقصود علی خاں صاحب سحرؔ' جناب ابوالفیض سید احمد عابدؔ صاحب' محترمہ اہلیہ حضرت ابوالفتح سید جلال الدین صاحب یداللّٰہی مرحوم اور جناب سید نور محمد صاحب (سان کمپیوٹر) جناب شیخ چاند ساجد صاحب شامل ہیں' ان کے مشکور ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان تمام کو اس کام کا اجر عطا کرے۔ آمین

ہمیں امید ہے کہ افرادِ قوم اس کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔

سید عبداللہ اطہر
معتمد مہدویہ فاونڈیشن

رویائے خلیلؑ

قربانی کا دستور یا ذبیحہ کا رواج دنیا میں اس وقت سے جاری ہے جب سے کہ بنی آدم نے دنیا میں اپنا راج شروع کیا ہے۔ چنانچہ ہابیل وقابیل کا قصہ جو قرآن شریف میں مذکور ہے کہ ان دونوں نے خدا کی جناب میں اپنی اپنی قربانی پیش کی تھی جس میں سے ایک کی مقبول اور دوسرے کی نامقبول ہوئی۔ ہمارے اس دعویٰ کا بین ثبوت ہے لیکن یہ وہ قربانی ہے جس کے لئے سال میں کوئی مہینہ اور مہینہ میں کوئی دن مقرر ومعین نہیں تھا۔ شریعت محمدیہ میں قربانی کے لئے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کی خصوصیت اور اس تاریخ کی بناء واصلیت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا وہ ''رویا' یا خواب'' ہے جس کی بناء پر آپ نے اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیلؑ کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالنا چاہا تھا۔ لہذا ہم اس وقت حضرت ابراہیمؑ کے اسی خواب اور مالہ وماعلیہ سے بحث کریں گے۔

اس سے قبل کہ ہم رویائے خلیل کی نسبت کچھ عرض کریں ناظرین کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی کے مثل یا وحی کے منجملہ ہوتے ہیں اور خدائے تعالیٰ نے ان کے خوابوں کو سچا کر دکھایا ہے اور اس سے صرف ان دلائل وبراہین کو تقویت دینی مقصود ہے۔ جو انبیاء کرام کی حقیقت وصداقت کے موید یا ان کے برسرحق ہونے کے مثبت ہیں کیونکہ انسان کی دو ہی حالتیں ہیں ایک حالتِ بیداری اور دوسری حالت خواب۔ جب ان دونوں حالتوں میں صدف پایا جائے تو تب ہی انبیاء کی صداقت کی تکمیل اور ان کی حقانیت کی غایت اور انتہا ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر خواب کی تعبیر اور اس کے حکم ایک ہی نہیں ہوتا بلکہ حسب مدارج ومراتب رائی' خواب کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں ایک وہ جس کی تعبیر میں بعینہ وہی خواب واقع ہو مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے قبل ایک خواب دیکھا تھا کہ آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے ہیں۔ چنانچہ بعد میں مکہ معظّمہ فتح ہوا۔ اور آنحضرت ﷺ اسی طرح

مسجد الحرام میں داخل ہوئے۔اسی واقعہ کی طرف خدائے تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے

''**لقدصدق الله رسوله الروياء بالحق لقد خلن المسجد الحرام انشاء الله**''۔

یعنی''بیشک اللہ نے اپنے رسول کوسچا خواب دکھایا ہے انشاءاللہ تم (مسلمان) مسجد الحرام میں داخل ہوں گے''

دوسرا وہ خواب ہے جس کی تعبیر میں تاویل وتوجیہہ کرنی پڑی جیسے یوسف علیہ السلام نے یہ خواب دیکھا کہ آپ کو گیارہ ستارے سورج اور چاند نے سجدہ کیا ہے۔ یہاں ستاروں سے آپ کے گیارہ بھائی' سورج سے والدامجد اور چاند سے والدۂ محترمہ مراد ہیں۔

تیسری وہ قسم ہے جس کی تعبیر برعکس ظہور میں آئی مثلاً ابراہیم علیہ السلام کا یہی خواب کہ آپ نے فرزند کوذبح کرتے دیکھا۔مگر آگے معلوم ہوگا کہ بجائے فرزند کے دنبہ ذبح کیا گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی **رب هب لی من الصالحين**۔ باری تعالیٰ مجھے ایک صالح لڑکا عطا فرما۔ چنانچہ یہ دعا مستجاب ہوئی اور آپ کی حسب خواہش ایک فرزند حلیم کی پیدائش کی بشارت دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد بی بی ہاجرہ کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا۔ابراہیمؑ نے اپنے بڑھاپے کی کمائی کا نام اسماعیلؑ رکھا اور کاتب تقدیر نے تو قدرت کا یہ فتویٰ ازل ہی میں لوح محفوظ پر ثبت کردیا تھا کہ خاتم النبیین ﷺ اسی نسل سے ہوگا۔غرض جب اسماعیلؑ چلنے پھرنے لگے اور اس قابل ہوئے کہ گھر کے کام وکاج اور اشغال وحوائج میں والدین کا ہاتھ بٹاسکیں تو ابراہیمؑ نے وہ خواب دیکھا جس کی وجہ سے آپ کو **امتثالاً لا امر الله** اپنے اس لخت جگر کوذبح کرنے نیز اکلوتے اور عزیز بیٹے کی فانی محبت کوخدائے تعالیٰ کی دائمی اور ابدی محبت پر قربان کرنے کی ضرورت داعی ہوئی۔

امام فخر الدین رازیؒ نے بیان کیا ہے یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ آیا ابراہیمؑ نے خواب میں فرزند کوذبح کرتے دیکھا یا کوئی اشارہ وکنایہ پایا گیا جو اس فعل پر دلالت کرتا ہو۔مفسرین نے تصریح کی ہے کہ ابراہیمؑ سے خواب میں یہ کہا گیا کہ'' **ان الله يامران بذبح ابنک هذا**'' خدا آپ کو حکم دیتا ہے کہ اس لڑکے کوذبح کیجئے پہلی مرتبہ آپ اسی فکر وتردد میں رہے کہ یہ الہام رحمانی ہے یا وسوسہ شیطانی۔لیکن جب متواتر تین روز یہی معاملہ پیش آتا رہا تو آپ کو یقین ہوگیا کہ ہو نہ ہو یہ حکم منجانب

اللہ ہے۔ اسی روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے خواب میں وہ چیز دیکھی جو ذبح فرزند پر دلالت کرتی تھی۔ لیکن آیت قرآنی سے اس کی تائید نہیں۔ خدائے تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ سے مخاطب ہوکر یہ بیان کیا کہ میں نے خواب میں تم کو ذبح کرتے دیکھا ہے۔ واللہ اعلم

ذی الحجہ کا مہینہ دسویں تاریخ اور صبح کا وقت ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک چھری اور رسی لئے ہوئے مقام منیٰ کی طرف جو مکہ معظّمہ سے قریب ایک چھوٹی سی گھاٹی ہے تشریف لے جارہے ہیں حضرت اسماعیلؑ بھی باپ کے ایماء سے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں بچے تو تھے ہی ایسی عمر کیا تھی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد تھک گئے اور پوچھنے لگے کہ ابا جان کہاں چلو گے؟ باپ نے کہا بیٹا اس سامنے کی گھاٹی سے کچھ لکڑیاں کاٹ لائیں گے یہ سن کر اسماعیلؑ خاموش ہوگئے اور باپ کے ساتھ ہو لئے۔

اس کے بعد وہ حیرت انگیز واقعہ یا عبرت خیز مکالمہ نظروں کے سامنے آتا ہے جس کو ہر مفسر اور مورخ برابر پابندی سے لکھتا چلا آرہا ہے کہ ابلیس لعین جو ایسے موقعہ کی تاک جھانک میں ہی رہا کرتا ہے ایک مقدس صورت میں بی بی ہاجرہ کے پاس آیا اور کہا کہ تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو کچھ اس کی بھی خبر ہے کہ ابراہیمؑ تمہارے بیٹے اسماعیلؑ کو کہاں لے گئے ہیں؟ ہاجرہ نے کہا وہ دونوں لکڑیاں لانے ابھی ابھی اس گھاٹی تک گئے ہیں۔ ابلیس نے کہا ایسا نہیں ہے بلکہ ابراہیم تو تمہارے بیٹے کو وہاں ذبح کریں گے، ہاجرہ نے کہا بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے وہ تو اسماعیلؑ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ کہیں باپ بھی بیٹے کو عمداً قتل کرتا ہے۔

کدامے پدر این چنین کارکرد؟

اس نے کہا ابراہیمؑ تو کہتے ہیں خدا کا اسی طرح حکم ہوا ہے ہاجرہ نے فرمایا جب خدا کا حکم ہے تو بیشک ابراہیمؑ کو اس کے حکم کی اتباع کرنی چاہئے۔ میں تو اس معاملہ میں دم بھی نہیں مار سکتی۔ اگر ابراہیمؑ چاہیں تو اپنے بیٹے کے بعد یہاں آکر مجھے بھی خدا کی راہ میں قربان کردیں۔ بی بی ہاجرہ کی اس عالی ہمتی سے وہ مایوس ہوکر اسماعیلؑ کو راستہ میں جا ملا یا۔ اور کہا صاحبزادہ کہاں جاؤ گے؟ اسماعیلؑ نے کہا ہم ابا جان کے ہمراہ لکڑیاں لانے کو جاتے ہیں۔ اس نے کہا تم کو غلط باور کرایا گیا؟ تمہارے ابا جان تو تمہیں ذبح کرنے لے جارہے ہیں۔ اسماعیلؑ نے کہا یہ کیوں۔ ابلیس نے کہا ان کا بیان ہے کہ خدا کا

یہی حکم ہے۔اسماعیلؑ نے کہا اگر خدا کا حکم ہے تو مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے۔انہیں ایسا ہی کرنا چاہئے میں ہر طرح حاضر ہوں۔ یہاں سے بھی ناامیدی ہوئی تو ابراہیم علیہ السلام کے پاس گیا اور کہا کہ حضرت کہاں کا ارادہ ہے؟ آپ نے فرمایا ذرا اس گھاٹی تک! کچھ ضرورت ہے ابلیس نے کہا'' کیا یہ صحیح ہے کہ رات میں شیطان نے آپ کو صاحبزادہ کے ذبح کا حکم دیا ہے؟ کیا آپ واقعی اس معصوم کو ذبح کریں گے؟ اور کیا آپ بالکل اس کام پر آمادہ ہیں؟ اگر حاصل یہی ہے تو اس وسوسۂ شیطانی کو دل سے دور فرمادیجئے۔ابراہیم علیہ السلام نے اس کو پہچان لیا اور کہا کہ خدا کے دشمن پرے ہٹ۔خدا نے جو کچھ حکم دیا ہے میں اس کی ضرور تعمیل کروں گا۔

ناظرین! یہ وہ کٹھن وقت ہے کہ ایسے موقعہ پر بڑے بڑے باخدا بزرگوں کے قدم کو بھی لغزش ہوئی ہے اور دامن صبر بھی ہاتھ سے چھوٹتا نظر آیا ہے۔لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام۔آپ کی خدا ترس بیوی بی بی ہاجرہ اور آپ کے کم عمر فرزند اسماعیلؑ کی ثابت قدمی سے ہماری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس سے زیادہ خدا کے حکم کی اتباع اور اس کی فرمانبرداری کی مثال زمانہ قیامت تک پیش نہیں کرسکتا۔حضرت ابراہیمؑ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔آپ خدائے جلیل کے خلیل۔اُس کے منتخب اور برگزیدہ بندے اور اولوالعزم پیغمبر ہیں۔آپ خدا کے راہ میں جتنی بھی ثابت قدمی' عزم بالجزم' استقلال اور مشکلات ومصائب میں جس قدر بھی صبر وشکیب سے کام لیں وہ آپ کا شیوہ ہے۔چنداں قابل تعجب نہیں۔تعجب ہے اس ماں پر جس نے خدا کی راہ میں بیٹے کو قربان کرنے کے لئے اور تعجب پر تعجب اس کم سن بھولے بھالے بچے پر جس نے خدا کی راہ میں قربان ہونے کے لئے ایسی ثابت قدمی سے کام لیا جو ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کا حصہ تھا۔

غرض جب دونوں باپ بیٹے منزل مقصود پر پہنچ چکے تو حضرت ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ سے مخاطب ہوکر فرمایا'' پیارے بیٹے میں نے تم کو خواب میں ذبح کرتے دیکھا ہے کہو تمہاری کیا رائے ہے۔(پارہ ۳ رکوع ۱) کیا تم اپنی پیاری اور ننھی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنے تیار ہو؟ اسماعیلؑ نے جواب دیا ابا جان آپ کو جو کچھ حکم دیا گیا ہے بے تامل اس کی تعمیل کیجئے انشاءاللہ آپ مجھے بھی ہر طرح صابر پائیں گے'' چنانچہ حضرت ابراہیم نے امتثالا لامر اللہ محبت پدری نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ فطرت انسانی

کے خلاف اپنے قرۃ العین کو خدا کی جناب میں نذر دینے اور خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اسماعیلؑ نے عرض کیا اس طرح ذبح نہ فرمایئے بلکہ پہلے میرے اعضاء رسی سے اچھی طرح باندھ دیجئے شاید تکلیف سے مضطرب ہوکر ہاتھ پیر مارنے لگوں اور آپ کو رحم آجائے۔ آپ اپنے کپڑے علیحدہ رکھ دیجئے ایسا نہ ہو کہ خون کے دھبے دیکھ کر اماں غمگین ہوں اور میری قربانی کا اجر وثواب کم ہوجائے۔

اگر خونم بریزی غم ندارم زاں ھمی ترسم

کہ ناگہ دامن پاکت شود از خونم آلودہ

چھری کو اچھی طرح تیز کر لیجئے اور حلق پر جلد از جلد پھیریئے۔ اماں جان کو میرا آخری سلام فرمایئے اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری یہ قمیص اُنہیں پہنچا دیجئے کہ وہ اس سے تسلی وتسکین حاصل کرتی رہیں۔ ابراہیمؑ نے بیٹے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا'' جانِ پدر تم خدا کی مرضی ومشیت کو پورا کرنے میں میرے خوب معین ومددگار ہو'' غرض ابراہیمؑ نے بیٹے کی ایک ایک وصیت پر عمل کیا۔ اسی طرح قبلہ رخ لٹایا' رسیوں سے باندھا اور نہایت تیزی کے ساتھ اسماعیلؑ کے حلق پر چھری پھیرنی شروع کی۔ مگر خدا کی شان کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اثناء ذبح میں چھری کو دو تین بار تیز بھی کیا۔ مگر پھر بھی ناکامی ہوئی۔ اس خیال سے کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر ہاتھ کام نہ کرتا ہوگا' منہ کے بل لٹایا لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہوئی۔ اِدھر ملائکہ نے گڑگڑا کر خدا کی جناب میں التجا کی کہ بار خدایا اس بوڑھے باپ پر رحم کر اور اس معصوم بچے کا فدیہ عطا فرما۔ وہاں تو صرف آزمائش وامتحان مقصود تھا۔ جبرئیلؑ کو حکم مل گیا۔ حکم کی دیر تھی کہ وہ ایک دنبہ لئے ہوئے نکلے۔ دیکھا ابراہیمؑ ذبح کرنے کی کوشش کررہے تھے تو وہیں سے آواز دینی شروع کی۔ **اللہ اکبر اللہ اکبر**۔ ابراہیم نے یہ آواز سنی تو ہاتھ روک لیا اور اوپر دیکھا کہ جبرئیلؑ دنبہ لئے ہوئے آرہے ہیں تو آپ نے کہا **لا الہ الا اللہ واللہ اکبر**۔ اسماعیلؑ نے باپ اور جبرئیلؑ کی آواز سنی اور معلوم ہوا کہ اپنے فدیہ میں دنبہ ذبح کرنے کا حکم ہوا ہے تو آپ نے بھی فرمایا **اللہ اکبر وللہ الحمد** چنانچہ اس واقعہ ذبح کو خدائے تعالیٰ پارہ ۲۳ رکوع ۳ میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

''جب دونوں باپ بیٹے تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے ماتھے کے بل پچھاڑا تو (ہم کو ان کی فرمانبرداری نہایت پسند آئی) ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم (بس بس) تم نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا۔ نیک بندوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک یہ ایک کھلی ہوئی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو اسماعیل کا فدیہ دیا''

چنانچہ یہی قربانی جو دراصل ذبح ولد کا عوض ہے ابراہیمؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ تک مسلسل جاری رہی اور اسی کو اضحیہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی سنت جاریہ پر عمل کرنے کا تاکیدی حکم فرمایا ہے اور جب آپ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا **ھی سنت ابیکم ابراھیم** (یہ تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے)

الغرض اس تکلیف مالایطاق سے ابراہیمؑ کی آزمائش مقصود تھی کہ وہ اپنے عزیز اور ہونہار بیٹے کی محبت پر خدا کی محبت اور اس کے حکم کو کہاں تک ترجیح دیتے ہیں کیونکہ فطرت انسانی کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ آدمی کو اولاد سب سے زیادہ محبوب ومرغوب ہوتی ہے اور وہ اولاد کی معمولی سی ایذا اور خفیف سی تکلیف کو بھی فطرتاً برداشت نہیں کرسکتا چہ جائیکہ اس کو خود ہاتھ سے ذبح کرے۔ جب ابراہیمؑ اس امتحان میں ٹھیک ٹھیک پورے اترے تو خدائے تعالیٰ کا بھی اصل مقصد پورا ہوگیا کیوں کہ اس سے زیادہ حکم کی تعمیل اور کیا ہوسکتی تھی کہ ایک بوڑھا باپ اپنے ننھے معصوم بچہ کو جس کی عمر ابھی سات سال یا بروایتے تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہے خدا کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لئے ذبح کرنے کی تیاری کرتا ہے۔ اور اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ ''عبدِ خلیل کے دل میں رب جلیل کی محبت کے سوا کسی اور کی محبت جاگزیں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس ننھی سی جان کو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کلیجہ کا ٹکڑا بڑھاپے کا سہارا' تنہائی میں یار غار' رنج وغم کا غمگسار' المختصر اس معصوم بچہ کو بھی جو ساری عمر کی کمائی ہے خدا کی محبت پر قربان کرنے اور اس کے نام پر بھینٹ چڑھانے تک دریغ نہیں کرتا۔

☆☆☆☆☆

تشہد اور انگشت شہادت

ادائی نماز کے سلسلہ میں جن فرائض، واجبات اور سنن کی ادائیگی ضروری ہے ان میں سے ایک قاعدہ میں بیٹھنا بھی ہے، چراغ دین نبویؐ کے صفحہ ۳۷ پر دئے گئے جدول کے مطابق قاعدہ اولیٰ میں بیٹھنا واجبات سے ہے جبکہ قاعدہ آخری کو فرض بتایا گیا ہے۔ لیکن دونوں موقعوں پر تشہد کا پڑھنا واجب ہے۔ لیکن تشہد کے دوران جب نمازی اشھد ان لا الٰہ الا اللہ پر پہنچتا ہے تو بعض افراد ایک ہاتھ (سیدھے ہاتھ) کی انگشت شہادت اُٹھاتے ہیں اور بعض نہیں اُٹھاتے اس کی اصلیت وحقیقت پر حضرت افضل العلماء مولانا الحاج سید نجم الدین صاحب علیہ الرحمہ نے آج سے ۲۲ سال قبل ایک طویل مضمون سپرد قلم کیا تھا۔ جس کا ضروری اقتباس نوجوان نسل کی رہبری ورہنمائی کے لئے میلاد نمبر میں پیش خدمت ہے۔ (ادارہ نور حیات)

آئمہ مجتہدین میں بجز امام ابوحنیفہ کے باقی تینوں آئمہ یعنی حضرات امام شافعیؒ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں قعدہ اول ودوم میں تشہد پڑھتے وقت صرف سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت کو اُٹھانا سنت ومندوب ہے۔ حضرت امام اعظمؒ کے مذہب میں فقہائے متقدمین اس کے قائل نہیں ہیں۔ اسی واسطے متون معتبرہ میں سکوت اور عدم اجازت ہے اور اکثر فتاویٰ حنفیہ میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ درالمختار میں لکھا ہے ''تشہد میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہتے وقت انگشت شہادت سے اشارہ نہ کرے اسی پر فتویٰ ہے۔ اسی طرح فتاویٰ عالمگیریہ میں عدم اشارہ کو مذہب مختار ومفتی بہ لکھا ہے۔

جب تشہد میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ پر پہنچے پر انگشت شہادت سے اشارہ کرے اور خلاصہ میں لکھا ہے مذہب مختار یہ ہے کہ اشارہ نہ کرے اور مضمرات میں بھی کبریٰ سے نقل کیا ہے کہ اشارہ نہ کرنے پر فتویٰ ہے اور اکثر فقہائے حنفیہ اشارہ کو جائز نہیں سمجھتے اور مغیۃ المصلی میں بھی مکروہ لکھا ہے

جیسا کہ تبین میں ہے۔صاحب ردالمختار نے لکھا ہے۔اکثر فقہائے حنفیہ اشارہ نہیں کرتے۔

غرض قدیم کتب فقہ مثلاً الو لجی، تجنیس، عمدۃ المفتی، فتاویٰ ظہیریہ، خلاصہ فتاویٰ، عتابیہ بزازیہ، تاتارخانیہ اور جامع المضمرات وغیرہ میں مذہب مفتی یہ یہی لکھا ہے کہ اشارہ نہ کیا جائے۔لیکن موطا، امام مالک، صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، مسند امام احمد بن حنبل، سنن، بیہقی، طبرانی، عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ کتب احادیث میں بروایات صحیحہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تشہد کے موقع پر انگشت شہادت سے اشارہ فرمایا ہے۔اسی بناء پر متاخرین فقہائے حنفیہ نے اس کے مسنون ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔چنانچہ صاحب درالمختار نے متقدمین کا عدم جواز کا مذہب لکھنے کے بعد متاخرین کا مذہب لکھا ہے۔

مستقدمین تو جائز کہتے ہیں لیکن قول متحد وہ جس کی شارحین نے تصحیح کی ہے خصوصاً متاخرین فقہائے حنفیہ مثلاً امام کمال الدین ابن ہمام، حلبی، بہنسی باقانی اور شیخ الاسلام نے اسی پر اعتماد کیا ہے کہ بوقت تشہد اشارہ کرنا چاہئے۔کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل تھا اور فقہا نے اس قول کو امام محمد اور امام ابوحنیفہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔اور درالمختار میں لکھا ہے کہ امالی میں امام ابو یوسف کا بھی یہی مذہب لکھا ہے کہ اشارہ کیا جائے۔گویا ہمارے تینوں آئمہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، اور امام محمد سے یہی مذہب منقول ہے کہ انگشت شہادت اُٹھائی جائے۔اور خود امام محمد نے موطا میں فرمایا ہے۔''عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشہد کے لئے بیٹھتے تو اپنے سیدھے ہاتھ کو سیدھے زانو پر رکھتے او سب انگلیوں کو بند کر کے انگشت شہادت سے اشارہ فرماتے اور بایاں ہاتھ بائیں زانو پر رکھتے تھے۔امام محمد کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عمل کو اختیار کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔

درالمختار میں ہے کہ اشارہ ایک ہی انگلی سے کرنا چاہئے۔چنانچہ لکھا ہے کہ ''صرف ایک سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت ہی سے اشارہ کیا جائے یعنی **لا الہ الا اللہ** کہتے وقت اُنگلی اٹھائے اور **الا اللہ** کہتے وقت رکھدے۔

درالمختار میں لکھا ہے کہ دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں سے اشارہ کرنا مکروہ ہے۔فتح القدیر وغیرہ میں یہی لکھا ہے۔فقہائے حنفیہ کہتے ہیں کہ صرف سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت سے

اشارہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ کٹی ہوئی ہو یا ایسا عذر ہو کہ اس کو اٹھایا نہ جاسکتا ہو تو پھر دائیں اور بائیں ہاتھ کی کسی انگلی سے بھی اشارہ نہ کیا جائے۔

اسی طرح اشارہ کے وقت انگلیاں کھلی نہ رہیں بلکہ قبض انامل سے یعنی انگلیوں کو بند کر کے انگشت شہادت سے اشارہ کرنا چاہئے۔ علامہ ابن عابدین ردالمختار میں لکھتے ہیں کہ عام لوگ جو انگلیوں کو کھلی رکھ کر اشارہ کرتے ہیں یہ عمل صحیح نہیں ہے اس کو صاحب ردالمختار کے سوا کسی نے نہیں لکھا اس سے ثابت ہوا کہ انگلیوں کو کھلی رکھ کر اشارہ کرنا حنفیہ کا مذہب نہیں ہے۔ ابن عابدین نے صاحب ردالمختار کی کافی تردید کی ہے کہ انگلیوں کو کھلی رکھ کر اشارہ کرنا حنفیہ کا مذہب نہیں مذہب صرف دو ہیں یا مطلقا اشارہ ہی نہ کیا جائے یا اگر اشارہ کیا جائے تو قبض انامل یعنی انگلیوں کو بند کرنا ضروری ہے۔

قبض انامل کے ردالمختار میں دو طریقے لکھے ہیں۔

(۱) اشارہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہتے وقت سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے اور درمیانی انگلی ملا کر حلقہ بنایا جائے۔ چھوٹی انگلی اور اس کے بازو کی انگلی کو اندر ہتھیلی کی طرف کرے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ کی انگلیوں کو اس طرح رکھے کہ ۵۳ کا ہندسہ بن جائے اس کی صورت یہ ہے کہ درمیانی انگلی اور اس کے بازو کی دونوں انگلیوں کو قبض کرے یعنی ہتھیلی سے ملالے اور انگوٹھے کو درمیانی انگلی کی درمیانی جوڑ پر رکھے اور انگشت شہادت کو نفی کے وقت یعنی لا الٰہ کہتے ہوئے اٹھائے اور اثبات کے وقت یعنی الا اللہ کہتے ہوئے رکھے۔

ابن عابدین لکھتے ہیں ان روایات سے ثابت ہے کہ مسنون اشارہ وہی ہے ایک خاص طریقہ سے ۵۳ کا ہندسہ بنا کر جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کیا جائے۔ مگر انگلیوں کو کھلی رکھ کر اشارہ کرنے کا کسی روایت میں ذکر ہی نہیں ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن عابدین نے لکھا ہے کہ ہمارے مذہب حنفیہ میں اس بارے میں صرف دو قول ہیں۔

(۱) ایک قول تو وہی ہے کہ حنفیہ میں معروف ومشہور ہے کہ تشہد پڑھتے وقت انگلیاں کھلی رکھیں

اور اشارہ نہ کیا جائے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ جب تک تشہد پڑھتے رہیں تب تک انگلیاں کھلی رہیں جب لا الٰہ کہیں تو حلقہ بنائیں اور انگشت شہادت سے اشارہ کریں یعنی لا الٰہ کے موقعہ پر انگلی اُٹھائیں اور الا اللہ کہتے ہوئے رکھ دیں۔

یہی دوسرا خیال متاخرین فقہائے حنفیہ کے پاس معتبر ہے کیونکہ احادیث صحیحہ سے رسول اللہ کا اسی طرح کرنا ثابت ہے۔اور یہ بات بھی صحت کو پہنچی ہے کہ ہمارے آئمہ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہ امام ابو یوسف اور امام محمد کا یہی قول ہے کہ انگشت شہادت اٹھائی جائے۔اسی وجہ سے امام ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ حنیفہ کے پاس جو قول (عدم رفع) مشہور ورائج ہے وہ درایت اور روایت کے خلاف ہے۔

امام ابن ہمام کا مطلب یہ ہے کہ تشہد میں انگشت شہادت کا اٹھانا سنت صحیحہ آئمہ اور حنفیہ کے اقوال سے ثابت ہے۔اگرچہ متقدمین فقہا اس کے قائل نہیں ہیں مگر یہ بات یعنی انگشت شہادت نہ اٹھانا عقل ونقل کے خلاف ہے۔کیونکہ لا الہ الا اللہ زبان سے کہتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا جائے تو اثبات ونفی کا اقرار قول وفعل دونوں سے ہوجاتا ہے اور قول وفعل دونوں میں مطابقت ہوجاتی ہے لہذا زبان کے ساتھ انگلی سے اشارہ کرنا موافق عقل اور نہ کرنا مخالف عقل ہے۔

اور اسی طرح اشارہ کرنا جب احادیث صحیحہ سے اور امام ابوحنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے ثابت ہے تو موافق نقل ہے اور نہ کرنا نقل کے خلاف ہوا۔اسی وجہ سے اکثر فقہائے حنفیہ کے پاس یہ عمل مندوب ومستحب ہے۔اور علامہ ابن العابدین نے ردالمختار میں اس کو سنت کہا ہے اور امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کا بھی یہی قول ہے اور احادیث وآثار کی کثرت کو دیکھتے ہوئے اس پر عمل کرنا اولیٰ ہے۔

☆☆☆☆☆

تکرارِ جماعت

کسی مسجد میں ایک مرتبہ نماز باجماعت ہوجانے کے بعد پھر دوسری جماعت کے جواز وعدم جواز کے بارے میں استفسارات پیش نظر ہیں اس مسئلہ کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

فقہاء نے مسجد کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ایک مسجد محلّہ' دوسری مسجد طریق۔مسجد محلّہ وہ ہے کہ جس کے امام مصلی اور موذن مقرر ومعین ہوں اور مسجدِ طریق وہ ہے جو شارعِ عام پر واقع ہو اور جس کا کوئی امام اور موذن مقرر نہ ہو یعنی اس مسجد میں جماعت اور اذاں وغیرہ کا باضابطہ انتظام نہ ہو۔راہرو آتے رہیں اور نماز پڑھتے رہیں۔ردالمختار میں لکھا ہے۔

والمراد بمسجد المحلة ماله امام وجماعة معلومون

یعنی''مسجد محلّہ اس کو کہتے ہی کہ جس کا امام اور اس میں نماز پڑھنے والے معلوم ومعین ہوں۔

اور مسجد طریق کی تعریف یہ لکھی ہے۔'' **ليس له امام ولا موذن** ''یعنی''جس کا امام اور موذن مقرر نہ ہو'' مطلب یہ ہے کہ لوگ گروہ در گروہ آتے اور نماز پڑھ کر جاتے رہیں۔

دونوں مسجدوں کا حکم الگ الگ ہے۔اگر مسجد محلّہ میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت ہوچکی ہے تو اب اس مسجد میں دوسری جماعت اذان واقامت کے ساتھ مکروہ ہے۔چنانچہ درالمختار میں لکھا ہے۔**ويكره تكرار الجماعة باذان واقامة فى مسجد محلةلا فى مسجد طريق اوفى مسجد لا امام له ولاموذن**

یعنی''محلّہ کی مسجد میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت ہوجانے کے بعد اسی مسجد میں دوبارہ اذان کے ساتھ جماعت مکروہ ہے۔اگر مسجد شارع عام پر واقع ہو یا کسی مسجد کا کوئی امام وموذن مقرر نہ ہو تو ایسی مسجد میں اذان واقامت کے ساتھ تکرار جماعت مکروہ نہیں ہے''

علامہ عابدین نے اس مسئلہ کو وضاحت سے لکھا ہے۔**ويكره تكرار الجماعة فى مسجد محلة باذان و اقامة الا اذا صلى بهما فيه اولاًغيراهله او اهله لكن بمخافتة الا ذان ولو كرر اهله بدونهما اوكان مسجد طريق جازا اجماعا كما فى مسجد ليس له**

امام وموذن ویصلی الناس فیه فوجا فوجا فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامة علحدة(۱/۷۷۵) اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''مسجد محلّہ میں جس کا امام وموذن مقرر ہے پہلے مرتبہ اذان واقامت ہوجانے کے بعد دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ تکرار جماعت مکروہ ہے۔مکرر جماعت ہوتو اذان نہ دی جائے۔البتہ جومسجد راستہ پر واقع ہے یا جس کا امام وموذن مقرر نہیں ہے۔لوگ گروہ در گروہ آئیں اور جماعت سے نماز پڑھیں تو اذان واقامت سے ہر نماز کے جائز ہونے پر اجماع ہے بلکہ ہر جماعت کے ساتھ اذان واقامت کہنا افضل ہے۔''

اس مسئلہ میں مطلق جماعت زیر بحث نہیں ہے۔ بلکہ فقہاء نے ایسی جماعت کو مکروہ بتلایا ہے جس کے ساتھ اذان بھی دی جائے۔اس کا مطلب ہے کہ اگر متعدد جماعتیں بغیر اذان کے ہوتی ہیں تو کراہت نہی ہے۔اسی وجہ سے فقہانے جماعت کے ساتھ ''باذان واقامۃ'' کی قید لگائی ہے یعنی وہی جماعت دوبارہ مکروہ ہے جو اذان کے ساتھ ادا کی جائے۔

اذان سنتِ موکدہ ہے یعنی مسجد میں اذان کے بغیر جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں اور خلفائے راشدینؓ اور سلفِ صالحین کے زمانہ میں ہر نماز کی جماعت ایک ہی ہوتی تھی۔ کیونکہ جماعت بھی سنت موکدہ ہے۔ جماعت جس قدر زیادہ ہوگی ثواب بھی زیادہ ہوگا۔اگر مسجد میں جماعت کی تکرار ہوتو جماعت کم ہوگی اور ثواب بھی کم ہوگا۔اس لئے اگر تکرارِ جماعت کو روا رکھا جاتا تو لوگ وقت مقررہ شریک جماعت ہونے میں سستی کرتے اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں بار بار ہوتی رہتیں جو تقلیل ثواب کا باعث ہے۔حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اگر اصحاب رسولؐ جماعت میں شریک نہ ہوسکتے تو مسجد میں تنہا نماز پڑھ لیتے اور جماعت نہ کرتے تھے۔ یہ شارع علیہ السلام کی طرف سے وقت پر شریک جماعت نہ ہونے پر ایک قسم کی تادیب اور تنبیہ تھی۔

اسی بناء پر بعض فقہاء نے بیان کیا ہے کہ پہلی جماعت ہوجانے کے بعد دوسری جماعت نہ ہو بلکہ لوگ علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ فتاویٰ ظہیریہ میں اسی کو اصل مذہب اور ظاہر الروایۃ لکھا ہے یعنی کتب امام محمدؒ میں اسی طرح ہے لیکن علامہ ابن عابدین نے لکھا ہے کہ یہ قول اجماع کے خلاف ہے۔شرح منیۃ المصلی میں امام اعظمؒ سے روایت ہے کہ تین آدمیوں سے زیادہ ہوں تو جماعت ثانیہ مکروہ ہے ورنہ

نہیں۔اورامام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ مصلی کم ہوں یا زیادہ اگر جماعت ثانیہ ہئیت اولیٰ پر ہوتو مکروہ ہے۔ اور تبدیل ہئیت ہوجائے تو مکروہ نہیں ہے۔فتاویٰ بزازیہ میں تبدیل ہئیت کی صورت یہ لکھی ہے کہ اگر دوسری جماعت کا امام محراب سے ہٹ کر کھڑا رہے تو ہئیت بدل جاتی ہے۔اور دوسری جماعت مکروہ نہیں ہوتی۔فتاویٰ تاتارخانیہ اور فتاویٰ ولوالجیہ میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسف کے قول ہی پر فتویٰ ہے (ردالمختار)

اس سے ثابت ہے کہ کراہت کا حکم جس طرح کہ امام محمدؒ اور امام اعظمؒ سے منقول ہے اس وقت لگایا جاتا ہے جبکہ پہلی جماعت کی طرح دوسری جماعت بھی اسی اہتمام سے یعنی اذاں وغیرہ کے ساتھ ادا کی جائے۔اس صورت میں ارتفاعِ کراہت کے لئے امام ابو یوسفؒ کے مفتی بہ قول کے موافق تبدیل ہئیت کی ضرورت ہے۔

اگر دوسری جماعتیں اذاں کے بغیر ہوتی رہیں تو کراہت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں لکھا ہے۔**لا یکرہ مطلقا تکرار الجماعۃ فی مسجد المحلۃ بلا اذان و اقامۃ** یعنی ''اذان واقامت نہ ہوتو مسجد محلّہ میں تکرار جماعت مکروہ نہیں ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ تکرار جماعت اُسی وقت مکروہ ہے جب کہ ہر جماعت کے لئے اذاں دی جائے۔

ردالمختار میں لکھا ہے۔**اذا صلی فی مسجد المحلۃ جماعۃ بغیر اذان حیت یباح اجماعا** یعنی ''مسجد میں اذاں کے بغیر تکرار جماعت جائز ہونے پر اجماع ہے''

اسی طرح فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے **المسجد اذا کان امام معلوم و جماعۃ معلومۃ فی علۃ فصلی اھلہ فیہ بالجماعۃلا یباح تکرار ھافیہ باذان ثان و اماازا صلوا بغیر اذان یباح اجماعا** یعنی'' محلّہ کی مسجد میں جس کا امام اور مصلی معلوم ہیں اگر وہ لوگ جماعت سے نماز پڑھ چکے ہیں تو دوبارہ اذاں دے کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے البتہ بغیر اذاں کے دوبارہ جماعت کرنا اجماعاً جائز ہے۔

پس ایسی مسجد میں جس کا کوئی امام وموذن مقرر نہ ہو۔اس میں اذاں کے ساتھ تکرار جماعت افضل ہے۔اور مسجد محلّہ میں یعنی جس کا امام وموذن اور اس کے مصلی مقرر ومعین ہیں اذاں کے ساتھ تکرار جماعت مکروہ تحریمی ہے۔اگر اذاں دی جائے تو رفع کراہت کے لئے دوسری جماعت کے امام کو محراب سے ہٹ کر کھڑا رہنا چاہئے اور اگر اذاں نہ دی جائے تو تکرار جماعت بالاتفاق مکروہ نہیں ہے۔ اور نہ امام کو تبدیل مقام کی ضرورت ہے۔اور ہر جماعت کے ساتھ اقامت بھی کہی جاسکتی ہے۔ooo

نکاح غائبانہ

نکاح غائبانہ درست ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عاقدین مجلس عقد میں موجود نہیں ہیں۔ عموماً عاقدہ تو مجلسِ عقد میں موجود نہیں رہتی اس کی طرف سے اس کے ولی یا اس کے وکیل کا ایجاب کرنا عادتِ جاریہ اور سنت مستمرہ ہے۔اگر عاقد بھی مجلس عقد میں موجود نہ ہو اور اس نے کسی کو وکیل مقرر کیا ہو تو وکیل دو گواہوں کے سامنے قبولیت کا اقرار کرسکتا ہے۔یا عاقد کا خط آیا ہو اور دو آدمی اس خط کو پڑھ کر عاقد کی قبولیت کے گواہ ہوں تو اس صورت میں بھی عقد جائز ہے۔چنانچہ درالمختار میں لکھا ہے۔

ولا ینعقد بکتابة حاضر بل غائب بشرط اعلام الشهود بما فی الکتاب

یعنی عاقد مجلس عقد میں حاضر ہونے کے باوجود اپنی قبولیت کاغذ پر لکھ دے تو نکاح درست نہیں ہے۔البتہ شخص غائب کی خط وکتابت سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے بشرطیکہ گواہ اس کے خط کو پڑھ کر اس کی قبولیت سے مطلع ہوگئے ہوں''

درالمختار کی اس عبارت مذکورہ کی شرح میں علامہ ابن عابدین فتح القدیر سے نقل کرتے ہیں۔

فانه قال ینعقد النکاح بالکتاب کما ینعقد بالخطاب وصورته ان یکتب الیها یخطبها فاذا بلغها الکتاب احضرت الشهود وقرائة علیهم وقالت زوجت نفسی منه او تقول ان فلا فاکتب الی یخطبنی فاشهدوا انی قد زوجت نفسی منه (ردالمختار صفحہ۲/۴۰۹)

یعنی امام ابن ہمام نے لکھا ہے کہ جس طرح مجلس عقد میں مرد کے زبانی اقرار سے نکاح صحیح ہوتا ہے اسی طرح اگر وہ غائب ہو تو اس کی خط وکتابت سے بھی نکاح درست ہے۔مثلاً کسی شخص نے کسی عورت کو لکھا کہ میں تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔اگر اس خط کے وصول ہونے کے بعد عورت نے گواہوں کے سامنے اس خط کو پڑھ کر سنایا اور کہا کہ میں نے اپنی ذات کو اس کی زوجیت میں دیدیا ہے یا یہ کہا کہ فلاح شخص نے مجھ سے نکاح کرنے کی خواہش کی ہے تم گواہ رہو کہ میں نے اس سے نکاح کرلیا ہے تو یہ جائز ہے''

اسی طرح عالمگیر یہ میں لکھا ہے۔**ولو ارسل الیها رسولاً وکتب الیها بذلک کتابا فقبلت بحضرة الشاهدین وسمعا کلام الرسول وقراء ة الکتابة جاز** (صفحہ۹۷)

یعنی ''کسی شخص نے ایک عورت کو لکھا کہ میں نے تجھ سے نکاح کیا ہے اور اس عورت نے دو گواہوں کی موجودگی میں اس کو قبول کر لیا اور گواہوں نے قاصد کا کلام اور خط کو سن لیا تو نکاح جائز ہے'' اگر عاقد اور عاقدہ دونوں بھی مجلس عقد میں موجود نہ ہوں اور ان دونوں کے وکیل ایجاب وقبول کریں تو جائز ہے۔ احادیث اور کتب سیر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین ام حبیبہؓ سے جو حبش میں تھیں، غائبانہ عقد فرمایا ہے نکاحِ نبوی کا یہ پُر تاثیر واقعہ ذرا تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

ام حبیبہؓ کا نام رملہ تھا۔ ابوسفیان کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی بہن ہیں۔ ابوسفیان ذات اقدس ﷺ، اسلام اور مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے۔ البتہ اسلام لانے کے بعد اسلام کی خدمت کے لئے بڑے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ ابوسفیان کی بیوی یعنی ام حبیبہؓ کی والدہ جن کا نام ''ہندہ'' تھا مسلمانوں کی سب سے زیادہ دشمن تھیں۔ جنگ احد میں حضرت حمزہؓ کے شہید ہوجانے کے بعد ان کا پیٹ چیرا اور کلیجہ چبا ڈالا۔ بعد میں اللہ کے فضل سے یہ سب مسلمان ہوئے لیکن ام حبیبہؓ اپنے ماں باپ اور بھائی سے سالہا سال قبل آغاز اسلام ہی میں مسلمان ہوگئیں تھیں۔ عبیداللہ بن جحش سے شادی ہوئی تھی اور ام حبیبہؓ کی ترغیب سے وہ بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ کفار مکہ نے مسلمانوں کو تکلیف دینی شروع کی تو رسول اللہ ﷺ کے ایماء سے دوسرے مسلمانوں کی طرح ان دونوں نے بھی حبشہ کو ہجرت کی اور عرصہ دراز تک حبشہ میں رہے۔ وہاں عبیداللہ نصرانی ہوگیا۔ ام حبیبہؓ نے اس سے جدائی اختیار کر لی اور اسی حالت کفر میں اس کا انتقال ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ کو ام حبیبہؓ کے مصائب اور صبر واستقلال اور استقامت فی الدین کی اطلاع ملی، آپ اس وقت مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرما چکے تھے۔ اوائل محرم ۷ ہجری میں حضرت نے عمرو بن امیۃ الضمیری کو خط دے کر نجاشی بادشاہ حبش کے پاس روانہ فرمایا اس وقت نجاشی مسلمان ہوگیا تھا۔ حضرت نے اس کو لکھا کہ ام حبیبہؓ کو نکاح کا پیام دو اور میری طرف سے تم ان کو میرے عقد میں قبول کرو۔ نامۂ اقدس وصول ہونے کے بعد نجاشی نے اپنی خاص لونڈی افرہہ کو ام حبیبہؓ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ تم کسی کو اپنی طرف سے وکیل مقرر کر کے میرے پاس بھیج دو جو نکاح کا ایجاب کرے۔ یہ خبر مسرت اثر سن کر ام حبیبہؓ نے افرہہ کو چاندی کے کنگن، پازیب اور کچھ انگوٹھیاں وغیرہ تحفہ دیں اور خالد بن سعیدؓ جو ہجرت کر کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حبشہ میں تھے اپنی طرف سے وکیل مقرر کر کے نجاشی کے پاس بھیجا اسی دن نجاشی نے اپنا دربار منعقد کیا سب

مسلمانوں کو اور حضرت جعفر طیارؓ (برادر حضرت علیؓ) کو جو مکہ سے ہجرت کر کے حبش میں مقیم تھے دربار میں بلایا اور حمد ونعت کے بعد کہا۔ ''میں نے چار سو دینار مہر کے معاوضہ میں ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کو محمد رسول اللہ ﷺ کے عقد میں قبول کیا ہے''

حضرت خالد بن سعیدؓ نے بھی مختصر خطبہ پڑھ کر ایجاب کیا اور فرمایا۔

''میں نے ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کو محمد رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں دیدیا ہے''

نجاشی بادشاہ حبش نے اہل دربار اور تمام مسلمانوں کو دعوتِ ولیمہ دی۔ وہ جانتا تھا کہ ولیمہ سنت انبیاء ہے۔ کھانے کے بعد سب رخصت ہوئے۔ نجاشی نے چار سو دینار رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مہر ادا کیا اور خالد بن سعیدؓ نے وہ دینار حضرت ام حبیبہؓ کے حوالے کر دیئے۔ نجاشی نے افرہہ کے ذریعہ اپنی محلات اور دوسری عورتوں کی طرف سے عود، مشک، زعفران اور عنبر وغیرہ مختلف تحائف بھیجے۔ ام حبیبہؓ نے افرہہ کو مزید پچاس دینار اور انعام دیئے لیکن اس نے انکار کیا اور کہا کہ بادشاہ نے مجھے کچھ لینے سے منع کر دیا ہے اور پہلی سب چیزیں بھی واپس کر دیں اور کہا کہ میں بھی مسلمان ہو چکی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں میرے اسلام کی اطلاع پہنچا دیجئے۔ اس کے بعد نجاشی نے شرحبیل حسنہ کو ساتھ دے کر ام حبیبہؓ کو احترام کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ منورہ کو روانہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ سب واقعات کو سن کر اور تحفہ وتحائف کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ افرہہ کے جواب میں فرمایا کہ اس پر اللہ کا سلام ہو اور اللہ کی رحمت و برکت اس کے شامل حال رہے۔

ابوسفیان مکہ میں تھے اور اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس واقعہ کو سن کر کہا ام حبیبہؓ کا نکاح ایسے شخص سے ہوا ہے جس کی عزت وحرمت میں کوئی کلام نہیں وہ اسی حالت کفر میں رسول اللہ ﷺ سے ایک معاہدہ کی تجدید کے لئے مکہ سے مدینہ آئے، اپنی بیٹی ام حبیبہؓ سے بھی ملے اور اس مسند پر بیٹھنا چاہا جس پر رسول اللہ ﷺ تشریف رکھتے تھے۔ ام حبیبہؓ نے اس کو اٹھالیا یہ بات ابوسفیان کو ناگوار گزری انہوں نے کہا کیا وہ میرے بیٹھنے کے قابل نہیں ہے یا میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس پر بیٹھوں؟ ام حبیبہؓ نے کہا تم مشرک ہو میں تم کو رسول اللہ ﷺ کے فرش پر نہیں بٹھا سکتی۔ ابوسفیان نے کہا ام حبیبہؓ تو بہت گمراہ ہوگئی ہے۔ پھر کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے۔

یہ وہ صورت ہے کہ یہاں عاقدین یعنی رسول اللہ ﷺ اور ام حبیبہؓ مجلس عقد میں موجود نہیں ہیں۔

دونوں کے وکیلوں نے اپنے اپنے موکل کی طرف سے ایجاب وقبول کیا ہے۔اسی بنا پر فقہا نے لکھا ہے کہ **ینعقد النکاح بالکتاب کما ینعقد بالخطاب** یعنی'' جس طرح ایک دوسرے کے زبانی اقرار سے نکاح منعقد ہوتا ہے اسی طرح خط وکتابت سے بھی منعقد ہو جاتا ہے''

اگر عاقدین مجلسِ عقد میں موجود ہوں اور بالمواجہہ ایک دوسرے سے ایجاب وقبول کرلیں تو اس صورت میں ولی یا وکیل کی ضرورت نہیں ہے صرف دو گواہوں کی موجودگی کافی ہے۔اسی کی طرف حدیث شریف میں اشارہ کیا گیا ہے۔''**لا تنعقد عقدۃ النکاح الا بحضرۃ الشاھدین العاقلین البالغین المسلمین**''یعنی'' دومسلمان عاقل وبالغ گواہوں کی موجودگی میں مرد اور عورت ایجاب وقبول کریں تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ انعقاد نکاح کے لئے کم از کم دو آدمیوں کا ایجاب وقبول کے وقت موجود رہنا ضروری ہے۔کیونکہ نکاح میں اعلان شرط ہے اور دو گواہوں سے یہ شرط پوری ہو جاتی ہے۔ اگر مرد وعورت نے گواہوں سے کہا کہ تم اس نکاح کا اظہار نہ کرو تو تب بھی نکاح درست ہے۔صرف ترک مستحب ہوا' کیونکہ اعلان عام نہ ہوسکا۔

ایجاب وقبول ایک فقہی اصطلاح ہے عاقدین میں سے جو پہلے کلام کرے اس کو'' ایجاب'' اور جو بعد میں کرے اس کو'' قبول'' کہا جاتا ہے۔ایجاب وقبول صیغۂ ماضی سے ہونا ضروری ہے۔یعنی میں نے نکاح کیا یا یہ کہ میں نے قبول کیا۔حال اور استقبال سے ایجاب وقبول ناجائز ہے۔اگر کہے میں کروں گا تو ناجائز ہے۔کیونکہ زمانہ مستقبل تو معدوم محض ہے۔اور صیغۂ مضارع (قبول کرتا ہوں) حال واستقبال کا مجموعہ ہے لہذا حال واستقبال کے صیغۂ سے نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

چونکہ نکاح میں مداومت ہوتی ہے۔اس لئے ایسے الفاظ سے نکاح صحیح ہوتا ہے جن میں مداومت پائی جاتی ہے اس لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ میں نے نکاح کیا یا میں نے اپنی ذات کو تجھے دے دیا' یا ہبہ کردیا' یا بخش دیا وغیرہ لیکن ایسے الفاظ سے جن میں تملیک ومداومت نہیں پائی جاتی نکاح درست نہیں ہے۔بعض ناواقف خطیب وکیل سے کہتے ہیں کیا آپ نے اجازت دی ہے؟ وکیل ہاں کہتا ہے تو مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی موکلہ کی اجازت دی ہے۔حالانکہ اجازت اور اجارہ میں تملیک نہیں ہے۔نکاح صحیح نہیں ہوتا۔در المختار میں لکھا ہے۔''**لا یصح بلفظ اجارۃ براء اور**

بزاء‘‘ یعنی ’’لفظ اجارت اور اجازت سے نکاح جائز نہیں ہے‘‘۔ کیونکہ اجارہ کے معنی کرایہ پر دینے کے ہیں۔ کوئی چیز کرایہ پر دی جائے تو اس سے تملیک ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس شئی سے ایک مدت مقررہ تک منفعت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور لفظ اجازت بھی تملیک کے لئے موضوع نہیں اور معنی تملیک میں مستعمل نہیں ہے۔ پس لفظ اجازت یا اجارہ سے نکاح درست نہیں۔

اگر عاقدین مجلس عقد میں موجود نہ ہوں تو ان دونوں کے وکیل ایجاب وقبول کر سکتے ہیں۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نجاشی بادشاہ حبش نے اور ام حبیبہؓ کی طرف سے خالد بن سعید نے قبول کیا تھا۔ اگر عاقدین موجود ہیں تو وکالت کی ضرورت نہیں' عاقدین کے ایجاب وقبول کے صرف دو مرد گواہ رہیں تو کافی ہے۔ امام خیر الانام حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے ام المصدقین بی بی بونجیؓ سے اس طرح نکاح فرمایا ہے۔ بی بی بونجیؓ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے پہلے شوہر ملک بخن تھے جن کا انتقال ہوگیا تھا۔ بی بی حالت بیوگی میں طالبِ خدا کی حیثیت سے دائرہ معلیٰ میں امامنا علیہ السلام کی خدمت وصحبت میں تھیں۔ امامنا علیہ السلام کی عادت تھی کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ عورتوں کے مجمع میں بیان قرآن فرماتے تھے۔ سفر خراسان میں بمقام ٹھٹھہ جمعہ کا دن تھا حضرت طالباتِ خدا کے سامنے بیان قرآن فرمار ہے تھے اثنائے بیان میں فرمایا۔ ’’هر كه از دادهٔ الٰهى نگير و اگرچه طلب نمايد نيابد‘‘ یعنی ’’خدا کسی کو کچھ دے اور وہ شخص نہ لے تو پھر وہ طلب کرے تو تب بھی وہ چیز اس کو نہیں ملتی‘‘

اس نقل مبارک کے اسرار ومعانی بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اجمالی طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ امام خیر الانام کی ذات اقدس ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ گنجینۂ رویت اور اسرار الٰہیہ کی مخزن ومنبع ہے۔ طالبانِ خدا اس کی قدر ومنزلت کو جانتے اور اس کے قدموں میں پامال ہو کر دین وایمان کے خزانے لوٹتے ہیں۔ بندگی ملک برہان الدین سے حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آیت کریمہ ’’لن تنالوا البر حتىٰ تنفقوا مما تحبون‘‘ (ہرگز حاصل نہ کرو گے بر کو جب تک خرچ نہ کرو اپنی پیاری چیز میں سے کچھ) میں بر سے مراد خدا کی ذات ہے جب تک اپنی عزیز چیز خدا کو نہ دو گے خدا نہ ملے گا۔ بندگی ملک برہان الدین نے اپنی تلوار اور گھوڑا اللہ دیدیا کہ یہ مجھے بہت عزیز ہیں۔ فرمایا یہ چیزیں کیوں عزیز ہیں؟ عرض کیا اس سے جان کی حفاظت ہوتی ہے۔ فرمایا پھر تو معلوم ہوا کہ

جان بہت عزیز ہے اور خدا یہی چاہتا ہے۔ بندگی ملک برہان الدین ترک دنیا کر کے خدمت میں رہ گئے اثناءعشر مبشر میں شمار ہوئے۔حضرت کی صاحبزادی بی بی فاطمہؓ کے شوہر اول بھی ہیں۔

جس طرح ایک طالبِ خدا کے لئے اپنی سب سے عزیز چیز یعنی'' جان'' خدا کو دیدینا ضروری ہے۔اسی طرح خدا کی سب سے بڑی نعمت کی بہمہ وجود قدر ومنزلت کرنا' طالب خدا کے کمال ایمان کی علامت ہے۔ بی بی بونجیؓ نے اپنی جان تو خدا کو دیدی تھی۔یعنی ترک دنیا کر کے طالب خدا کی حیثیت سے حضرت کی صحبت میں تھیں۔اب اس دادۂ الٰہی کو جس سے حضرت کی ذات اقدس مراد ہے' قبول کر لینے کی یہی ایک صورت تھی کہ'' جان'' کی طرح اپنا جسم عنصری بھی خدا کی راہ میں دیدیتیں۔مجمع سے اٹھ کر خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا میں اپنی ذات کو خدا کے لئے حضرت کو گزرانتی ہوں۔ اور عرض کیا میں نان ونفقہ کی طلبگار نہیں ہوں آرزو صرف یہ ہے کہ قیامت کے روز حضرت کے ازواج میں میرا حشر ہو۔امام علیہ السلام نے قبول فرمایا باہر سے میاں لاڑمہاجر اور قاضی حبیب اللہ مہاجر کو بلایا اور فرمایا۔ بی بی بونجیؓ نے خدا کے لئے اپنی ذات کو میرے سپرد کر دیا ہے تم دونوں گواہ رہو۔ان دونوں بزرگوں نے مہدی علیہ السلام اور بی بی کی زبان سے ایجاب وقبول کو سنا اور چلے گئے۔ یہ نکاح کی وہ صورت ہے کہ عاقدین موجود ہیں تو اب کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہے۔صرف دو گواہ انعقاد نکاح کے لئے کافی ہیں۔

عاقدین بھی موجود نہ ہوں اور ان دونوں کے وکیل بھی موجود نہ ہو بلکہ ایک نے اپنے مقام سے ایجاب کا اور دوسرے نے اپنے مقام سے قبولیت کا خط لکھ دیا تو اس صورت میں نکاح منعقد نہیں ہوتا۔کیونکہ یہاں ایجاب وقبول دو گواہوں کے سامنے نہیں ہو رہا ہے۔اگر فرض کیا جائے کہ عاقد نے اپنے مقام سے دو گواہوں کے سامنے لکھا کہ میں نے فلاں عورت کو اپنے نکاح میں قبول کیا' اور عاقدہ نے دو گواہوں کی موجودگی میں لکھا کہ میں نے فلاں مرد کو اپنے نکاح میں قبول کیا' تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ جو گواہ ایجاب کے ہیں وہ قبول کے گواہ نہیں ہیں۔اور جو گواہ قبول کے ہیں وہ ایجاب کے نہیں ہیں۔ اور پھر ایجاب ایک جگہ ہو رہا ہے اور قبول دوسری جگہ۔ حالانکہ جس طرح ایجاب وقبول کے گواہوں کا ایک ہی ہونا شرط ہے اسی طرح اتحاد مجلس بھی شرط ہے اگر ایجاب ایک جگہ ہو اور قبول دوسری جگہ ہو تو نکاح درست نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ کوئی مرد اور عورت چلتے چلتے ایجاب وقبول کریں تو

جائز نہیں ہے کیونکہ جس جگہ ایجاب ہورہا ہے اسی جگہ قبول نہیں ہوا ہے۔ پس عاقدین میں سے کوئی ایک مجلسِ عقد میں موجود ہوتو موجود اپنی زبان سے اور غیر موجود اپنے وکیل کے ذریعہ یا اپنے خط کے ذریعہ ایجاب وقبول کرے تو درست ہے۔ کیونکہ جو گواہ ایجاب کے ہیں وہی قبولیت کے بھی گواہ ہیں اور اتحادِ مجلس بھی ہے۔ رفع اشتباہ اور اہتمام مناسب کے بعد ٹیلیفون اور ٹرنک کال پر بھی نکاح ہوسکتا ہے۔ مگر چونکہ ایجاب وقبول کا ایک جگہ ہونا اور ایجاب وقبول کے گواہ ایک ہونا شرط ہے۔ اس لئے مجلس میں جو لوگ ایجاب کے گواہ ہیں اسی مجلس میں وہی لوگ قبول کے بھی گواہ رہنا ضروری ہے خواہ عاقد کا وکیل قبول کرے، یا عاقد کا خط پیش کیا گیا ہو، یا ٹیلیفون اور ٹرنک کال پر خود عاقد کی قبولیت کو سن لیں اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ ہوگی تو نکاح جائز نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں۔

اما لو لم تقل بحضرتهم سوى زوجت نفسى من فلان لا ينعقد لان سماع الشطرين شرط صحة النكاح وباسما عهم الكتاب او التعبير عنه منها (ردالمختار صفحہ ۲/ ۴۰۹)

یعنی ''عورت نے گواہوں کے سامنے یہ کہا کہ میں نے فلاں سے نکاح کیا ہے۔ تو نکاح درست نہیں ہے کیونکہ صحت نکاح کے لئے عورت اور مرد دونوں کے ایجاب وقبول کو گواہوں کا سننا ضروری ہے۔ اس لئے مرد کی قبولیت کا خط ان کو سنا کر یا کسی اور صورت سے گواہوں کو مرد کی قبولیت سے واقف کرانا چاہئے۔

لہذا خط یا وکالت کے ذریعہ گواہوں کا مرد یا عورت جو بھی غائب ہو اس کی قبولیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر خط یا وکالت دونوں بھی نہ ہوں تو انہی گواہوں کو ٹیلیفون یا ٹرنک کال پر اس کی قبولیت کو سننا شرط نکاح ہے۔

اگر کوئی عاقد یا عاقدہ اپنی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کرے تو جائز ہے۔ لیکن اس وکیل کا کسی دوسرے کو وکیل بنانا جائز نہیں ہے۔ فقہی ضابطہ یہ ہے۔ ''**الوكيل لا يملك التوكيل ايضاً ليس للوكيل ان يوكل**'' (ردالمختار صفحہ ۲/ ۴۰۷) یعنی ''وکیل دوسرے کو وکیل نہیں بنا سکتا'' اگر وکیل کے سوا کوئی دوسرا شخص ایجاب وقبول کرے تو چونکہ شخص غیر مجاز نے ایجاب وقبول کیا ہے اس لئے اس کو نکاح فضولی کہتے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ایسا نکاح عاقد یا عاقدہ کی منظوری پر موقوف رہے گا۔

اگر خود عاقد یا عاقدہ نے اپنے وکیل کو کسی دوسرے شخص کو وکیل بنانے کا اختیار دے دیا ہے تو

ایسی صورت میں اس دوسرے وکیل کا ایجاب وقبول درست ہے۔

اگر عاقد یا عاقدہ کسی کو وکیل مقرر کرے تو اس پر کسی کو گواہ رکھنا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ کسی بھی معاملہ کی انجام دہی کے لئے کسی کو وکیل بنایا جائے تو صحتِ وکالت کے لئے کسی کو گواہ رکھنا شرط نہیں ہے۔ یہی حکم وکیل نکاح کا بھی ہے۔ ردالمختار میں لکھا ہے۔ ''**اما الشهادة على التوكيل بالنكاح فليست بشرط لصحته**'' (صفحہ۲/۴۲۰) یعنی'' نکاح میں ایجاب وقبول کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنایا جائے تو اس پر گواہ رکھنا صحتِ وکالت کی شرط نہیں ہے''

اس کا مطلب یہ کہ اگر عاقد کا وکیل کہے کہ میں نے فلاں عورت کو اپنے موکل کے عقد میں قبول کیا۔ یا عاقدہ کا وکیل یہ کہے کہ میں نے اپنی موکلہ کو فلاں شخص کے عقد میں دیدیا ہے تو یہ وکالت صحیح ہے۔ ان کے اس بیان پر یقین واعتبار کرنے کے لئے گواہوں کی ضرورت نہیں ہے البتہ احتیاطاً گواہ رکھے جاتے ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں۔

وفائد تها الاثبات عند حجود التوكيل (''یعنی'' وکالت پر گواہ رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اگر وکیل وکالت سے انکار کرے تو ان گواہوں کے ذریعہ اس کی وکالت کو ثابت کیا جاسکتا ہے''

اس لحاظ سے جو طریقہ رائج ہے کہ عاقدہ کی طرف سے جو وکیل آتا ہے' دو گواہ اس کی وکالت کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ عمل احتیاطاً کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ گواہ نہ صرف وکالت کے گواہ ہیں بلکہ استیذ ان یعنی عاقدہ سے اجازت نکاح حاصل کرنے کے بھی گواہ ہیں۔ کیونکہ ولی کسی کو وکیل مقرر کردیتا ہے۔ لیکن عاقدہ سے اگر وہ عاقلہ وبالغہ ہے تو اس سے اجازت اور استرضا کی تکمیل ضروری ہے۔ اس لئے وکیل جب عاقدہ سے اجازت طلب کرتا ہے تو یہ گواہ موجود رہتے ہیں۔ احیاناً اگر عاقدہ عقد سے انکار کرے اور کہے کہ مجھ سے اجازت نہیں لی گئی تو یہ گواہ شہادت دے سکتے ہیں۔ لہذا اس طریقہ کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ نکاح غائبانہ میں عاقد کسی کو لکھدے کہ تم میری طرف سے فلاں عورت کو میرے نکاح میں قبول کرو' یا ٹرنک کال پر کسی کو وکیل بنادے تو کافی ہے۔ اس پر گواہوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایجاب وقبول کے گواہ نہیں ہیں۔ ایجاب وقبول کے گواہ تو پوری مجلس ہے۔ لہذا عاقد کی طرف سے کوئی وکالت کرے تو اس وکالت پر گواہوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر گواہ ہو تو قرین احتیاط ہے۔ البتہ وکالت کے تعلق سے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب کسی کو وکیل بنایا

جاتا ہے تو وکیل کا وکالت کو قبول کرنا ضروری ہے۔فرضاً وتقدیراً اگر عقد کے بعد وکیل انحراف کرے کہ میں نے وکالت قبول نہیں کی تھی صرف ولی کے بیان کو نقل کر دیا ہے۔تو اس صورت میں وکیل کی حیثیت ایک اجنبی کی ہے۔گویا ایک غیر مجاز شخص نے کسی کی بیٹی کو کسی کے عقد میں دیدیا ہے۔یہ شرعاً عقد فضولی کہلاتا ہے۔لہذا ولی یا عاقدہ کی اجامت پر موقوف رہے گا۔یہی وجہ ہے کہ وکیل سے اقرار لیا جاتا ہے کہ

حکم وکالت مذکورا ثابت است؟

یہ ایک معنی خیز اور بلیغ جملہ ہے جو تمام شرائط وکالت کو شامل ہے۔مطلب یہ ہے کہ کیا بہ ہمہ وجوہ تمہاری وکالت صحیح ہے۔اس کے جواب میں وکیل اقرار واعتراف کرتا ہے کہ'' آرے ثابت است''یعنی درحقیقت ولی نے مجھے وکیل بنایا ہے یہ گواہ موجود ہیں اور وکالت مجھے منظور ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وکیل اور گواہوں سے وکالت کا ثبوت لیا جانا۔اور عاقد یا اس کے وکیل سے اور عاقدہ یا اس کے وکیل سے ایجاب وقبول ایک مرتبہ کرانا کافی ہے۔لیکن تین مرتبہ کی تکرار جو عادت جاریہ ہے یقیناً مستحسن ہے۔ایک ہی بات بار بار اس لئے دہرائی جاتی ہے کہ اس تکرار سے ایک غبی آدمی وہ بات اچھی طرح سمجھ لیتا اور ایک ذہین وفہیم آدمی کے دل نشین ہو جاتی ہے۔تکرار کلام سے حفظ ویادداشت میں زیادہ مدد ملتی ہے اور اہم معاملات میں تکرار کلام سنتِ انبیاء اور سنت رسول اللہ ﷺ بھی ہے۔سیرت مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ''**اذا کان یدعو یدعو ثلاثا اذا سلم سلم ثلاثا . اذا تکلم تکلم ثلاثا**''یعنی'' رسول اللہ ﷺ جب کوئی دعا فرماتے جب اہل مجلس کو سلام کرتے۔اور جب کوئی (ضروری) بات ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ تکرار کرتے تھے''

یہی وجہ ہے کہ اہم اقوال وافعال میں تین کے عدد کو یا تین بار کی تکرار کو اس کام کی تکمیل وتتمیم کے لئے شریعتِ محمدیہ نے ضروری قرار دیا ہے۔چنانچہ وضو میں ہر عضو کو ایک مرتبہ دھونا فرض ہے۔لیکن ہر عضو کو تین مرتبہ دھو کر رسول اللہ ﷺ نے جو ارشاد فرمایا کہ ''**ھذا وضوی ووضوء الانبیاء من قبلی**'' یہ میرا وضو ہے اور انبیاءؑ بھی اسی طرح وضو کرتے تھے''اسی حکمت ومصلحت کی طرف اشارہ ہے۔

امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے کہ کسی بات کو سمجھانے کے لئے اس کی تین بار تکرار کی جانی چاہئے۔اور لکھا ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس فرمان کو بار بار دہرایا کہالا **وقول الزور** ''دیکھو جھوٹ بات سے بہت دور رہو''اور حضرت انسؓ سے روایت لکھی ہے کہ '' **انه کان اذا تکلم**

بکلمة اعادها ثلاثا حتی تفهم'' یعنی ''رسول اللہ ﷺ جب (کوئی خاص بات) ارشاد فرماتے تو اس کو تین بار لوٹاتے تھے اور وہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لی جاتی تھی''

۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر جو حضرت کا آخری حج تھا' ۹/ ذی الحجہ کو میدانِ عرفات میں اپنی اونٹنی قصواء پر تشریف فرما ہو کر ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا۔ احکامات دئے۔ ہدایات دیں' نصیحتیں کیں۔ خطبہ ختم ہوا تو فرمایا قیامت کے روز میرے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا بتاؤ تم کیا جواب دو گے۔ ایک لاکھ چوالیس ہزار مسلمان سامنے تھے سبھوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ آپ نے اللہ کے احکام ہم کو پہنچا دیئے۔ آپ نے نبوت ورسالت کا حق ادا کر دیا۔ اور ہم کو پوری نصیحتیں کر دیں۔ اس جواب پر حضرت اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے اور پھر لوگوں کی طرف جھکاتے اور ارشاد فرماتے تھے۔

اللهم اشهد' اللهم اشهد ' اللهم اشهد یعنی انگشتِ مبارک سے تین مرتبہ اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا' اے اللہ تو گواہ رہ کہ تیرے یہ بندے میرے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔

غرض سرور عالم ﷺ کی عادت تھی کہ کسی اہم بات کو سمجھانے اور مخاطب کے ذہن نشین کرنے کے لئے اور دعا کے موقع پر بھی اس بات کو تین بار فرماتے تھے۔ اور یہی طریقہ کسی کام کی تکمیل وتتمیم کے لئے تمام امت کے لئے مسنون ومستحب ٹھیرا۔

غرض نکاح یہی ہے کہ مرد اور عورت' دو مسلمان عاقل وبالغ آدمیوں کے سامنے اپنے میاں بیوی ہونے کا اقرار کر لیں۔ اسی کو عقد کہتے ہیں۔ مرد کو عاقد اور عورت کو عاقدہ کہا جاتا ہے۔ عاقدین موجود ہوں تو ولی یا وکیل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

عموماً عاقدہ تو مجلس عقد میں موجود نہیں رہتی اس کا وکیل ایجاب کرتا ہے۔ اگر عاقد اور عاقدہ دونوں بھی موجود نہ ہوں تو ان کے وکیل ایجاب وقبول کر سکتے ہیں۔ آج کل نکاح غائبانہ اسی کو کہا جاتا ہے۔ جس طرح عاقد اور عاقدہ اپنے وکیل کے ذریعہ یا اپنی خط وکتابت سے ایجاب وقبول کر سکتے ہیں اسی طرح ٹیلیفون اور ٹرنک کال پر نکاح ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ ایجاب وقبول کی تکمیل شرعی احکام کے مطابق ہو جائے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ اگر مجلس عقد میں عاقدہ کا وکیل موجود ہے اور ایجاب کر رہا ہے تو دو آدمی جو اس ایجاب کے گواہ ہیں وہی عاقد کی قبولیت کے بھی اسی مجلس میں گواہ رہیں۔ اس کی

تین صورتیں ہیں۔

(۱) عاقد نے اپنا خط بھیجا ہو اور ایجاب کے گواہ اس کو پڑھ کر قبولیت سے واقف ہو جائیں۔

(۲) یا عاقد نے کسی کو اپنا وکیل مقرر کیا ہو اور وکیل ایجاب کے گواہوں کے سامنے اپنے موکل کی طرف سے قبول کرے۔

(۳) یا خود عاقد ٹیلیفون یا ٹرنک کال پر اپنی زبان سے قبولیت کا اقرار کرے اور اسی مجلس میں ایجاب کے گواہ اس کی قبولیت کو سن لیں۔

ان تین صورتوں میں آخری تیسری صورت بہت اہتمام وانتظام چاہتی ہے۔ دور دراز مقامات سے ٹرنک کال وقت مقررہ پر ہونا تکلیف دہ اور مشکل ہے۔ اگر مختصر وقت میں اتنی گنجائش نکل سکتی ہے کہ ایجاب کے دونوں گواہ اس کی زبان سے قبولیت کو سن سکتے ہیں تو مناسب ہے۔

ورنہ اس سے آسان صورت یہ ہے کہ بذریعہ خط یا ٹرنک کال پر عاقد کسی کو اپنا وکیل مقرر کردے اور وہ مجلس عقد میں اپنی وکالت سے ان گواہوں کے مواجہہ میں قبولیت کا اقرار کرے جو ایجاب کے بھی گواہ ہیں۔

اس سے بھی زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ عاقد کسی کو خط لکھ دے کہ میں نے فلاں عورت کو اپنے عقد میں قبول کیا ہے۔ اور وہ خط مجلس عقد میں سنا دیا جائے یا خط پڑھ کر ایجاب کے گواہ اس کی قبولیت سے واقف ہو جائیں۔

یہ دونوں صورتیں نہایت مناسب اور آسان ہیں۔ عقد ہی کے روز عاقد کا خط آنا یا اسی روز اور اسی وقت ٹرنک کال پر عاقد کا کسی کو وکیل مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔ عقد کی مقررہ تاریخ ووقت سے پہلے بذریعہ خط کسی کو وکیل مقرر کرسکتا یا اپنی قبولیت کی اطلاع دے سکتا اور ٹرنک کال پر بھی قبل از قبل کسی کو وکیل بنا سکتا ہے۔ فقط

☆☆☆☆☆

شرائط نکاح

گروہ مہدویہ میں عقد نکاح کے موقع پر ایجاب وقبول کے وقت خطبہ نکاح کے بعد تعین مہر کے ساتھ چار شرائط شرعیہ کی پابندی کا بھی نوشہ سے قبولیت کا اقرار کروایا جاتا ہے ۔ بعدازاں ان شرائط کو اجمالاً بیان کیا جاتا ہے۔تقریباً چار سو سال سے یہ سلسلہ جاری ہے۔لیکن ان شرائط کی تشریح وتفصیل پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔تقریباً چالیس سال قبل کسی نے حضرت افضل العلماء مولانا سید نجم الدین صاحب صدر مجلس علمائے مہدویہ ہند کو دس سوالات پر مشتمل استفتاء کے ذریعہ ان مروجہ شرائط کی ضرورت' افادیت' اہمیت وشرعی حیثیت اور ان شرائط کے بارے میں ائمہ اربعہ کے مسلک پر روشنی ڈالنے کی خواہش کی تھی۔ چنانچہ موصوف نے اس پر نہ صرف اجمالی فتویٰ جاری کیا بلکہ اس کی ایک شرح بھی قلمبند کی تھی۔ پھر اس فتوی اور شرح کا خلاصہ بشکل مضمون مارچ' اپریل' مئی ۱۹۷۶ء کے ماہنامہ'' نور حیات'' میں شائع ہوا۔ اور نکاح غائبانہ پر مضمون جولائی ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔(مدیر نور حیات)

دور حاضر میں یہ دیکھا گیا کہ شرائط کو بیان کرنے پر بعض اصحاب ناگواری کا اظہار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شرائط غیر ضروری ہیں۔ حالانکہ یہ شرائط' شریعت کے عین موافق ہیں۔ چنانچہ ان شرائط کی جامعیت' ضرورت واہمیت کے پیش نظر افادۂ عام کی خاطر زیور طباعت سے آراستہ کیا جارہا ہے۔

کم وبیش چار سو سال سے قوم مہدویہ میں بوقتِ نکاح عاقد سے جن چار شرائط کی قبولیت کا اقرار کرایا جاتا ہے ان کے منجملہ ایک اہم اور مشہور ومتداول شرط یہ ہے کہ ''عاقدہ کا اختیار اس کے ہاتھ میں رہے گا'' اس کو فقہی اصطلاح میں شرطِ تخیر کہا جاتا ہے۔ گویا سلف سے ہمارا عملدرآمد شرعی مسئلہ کے تحت نکاح علی شرطِ تخیر پر ہے۔

یہ شرط نہ صحتِ نکاح کے لئے ضروری ہے اور نہ نکاح کے بعد اس شرط کی پابندی نہ کی جائے تو نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ عورت پر لازم وواجب ہے کہ خواہی نخواہی اپنے اختیار کو کام میں لائے۔ بلکہ یہ اختیار محض اس کے صوابدید پر موقوف ہے۔شدید ضرورت کے وقت اگر وہ مناسب سمجھے تو اس شرط سے کام لے سکتی ہے۔ اور اس میں جو فوائد مضمر ہیں ان کے لحاظ سے اس شرط کا بیان کرنا

نہایت ضروری ہے۔ اس شرط کا فائدہ یہ ہے کہ جس طرح طلاق دینا مرد کا اختیاری ہے کہ وہ جب چاہے طلاق دے سکتا ہے اسی طرح اس شرط کے ذریعہ طلاق کا حق عورت کے لئے بھی محفوظ کر دیا جاتا ہے کیونکہ بعض صورتوں میں مرد طلاق نہیں دیتا اور عورت اس کی شدید ضرورت محسوس کرتی ہے۔

لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ یہ علیحدگی عورت کی مرضی اور اس کے صوابدید پر موقوف ہے۔ جس شرط پر طلاق موقوف ہے اگر وہ شرط پوری نہ ہو تو اپنے اختیار کو کام میں لانا اور مرد سے علیحدہ ہو جانا عورت پر واجب نہیں ہے۔ اور نہ مرد کی عدم پابندیٔ شرط سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

قوم میں دو خطبۂ نکاح رائج ہیں۔

(۱) ایک خطبہ افضل علماء العالمین اجلہ تابعین حضرت العلامہ بندگی عبد الملک سجاوندی عالم باللہؒ کا مرتب کردہ ہے۔ جس میں حضرت نے اس شرط اول کو ایجاب کا جزو قرار دیا ہے اور اپنی افادیت، اہمیت اور ضرورت کے مدنظر کم وبیش چار سو سال سے پوری قوم میں اس خطبۂ کو قبولیت عامہ حاصل ہے۔

حضرت عالم باللہؒ کا خطبہ فارسی زبان میں نہایت فصیح و بلیغ ہے اور قوم میں زیادہ تر یہی رائج ہے۔ اس میں لحن ہے، سجع ہے سامعین کے لئے جاذب قلوب ہے اور فارسی میں ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ اس کو سمجھتے اور لذت اندوز ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرا خطبۂ نکاح منبع الحسنات، جامع الکمالات، قدوۃ العرفا، زبدۃ الفضلاء، حضرت بندگی میاں شاہ قاسم مجتہد گروہ مہدویہؒ نے مرتب فرمایا ہے۔ حضرت شاہ قاسمؒ نے میاں عالم باللہؒ کی بیان کردہ شرط کے علاوہ مزید تین شرطیں اضافہ فرمائی ہیں۔

(۱) نان ونفقہ دیتا رہے۔

(۲) عند الطلب مہر ادا کرے۔

(۳) دائرہ دین سے باہر نہ لے جائے اور والدین کے گھر جانے سے منع نہ کرے۔

حضرت شاہ قاسمؒ کی ذات قدسی صفات، علم ظاہر وعلم باطن، دونوں کی مجمع البحرین ہے۔ آپ نے جس دقّت نظر سے مرد کے اقتدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورت کو جو حقوق واختیارات دلائے ہیں اس سے حضرت کے تدبّر اور حسنِ تفقّہ پر کامل روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ چاروں شرطیں ایسی جامع ہیں کہ ان میں عورت کے لئے ہر قسم کی سہولت اور آسانی موجود ہے۔ گویا سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔

صرف ان کے منشاء وفحوی کو سمجھنے اور وقت پر ان سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

سینکڑوں سال گذر گئے کہ حضرت شاہ قاسمؒ نے شرائط نکاح مرتب ومدون کر کے اپنا فرض ادا کر دیا۔لیکن ان شرائط کی شرح وتفسیر کا قرض اب تک قوم کے ذمے باقی ہے۔غالباً خدائے تعالیٰ نے ان شرائط کی شرح وتبیین کی سعادت حضرت ہی کی نسل واولاد میں سے مجھ جیسے ایک ناخلف اور ننگِ خاندانِ شاہ قاسمؒ کے حصہ میں مقدر کر دی تھی اس لئے گو صحت معدوم اور فرصت موہوم ہے مگر چونکہ عمر ناپائیدار کا اعتبار نہیں ہے اس لئے یہی مناسب سمجھا کہ اسی صحبت میں اس پر گفتگو کر لی جائے۔

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگار ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

ان چار شرائط کے منجملہ پہلی شرط کی رو سے عورت کو مرد کے طلاق دینے کے بغیر از خود مطلقہ ہوجانے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔باقی تین شرطوں میں جن کو حضرت شاہ قاسمؒ نے اپنے خطبہ میں تحریر فرمایا ہے یہ حکم نہیں لگایا گیا ہے بلکہ ان شرائط کا مآل ونتیجہ یہ ہے کہ اختلاف کی صورت میں مقدمہ قاضی کے پاس دائر ہو تو فیصلہ عورت کے حق میں ہوگا۔اس وقت صرف ایک شرطِ تخیر یعنی ''اختیار او بدستِ او باشد'' کی افادیت' اس کی ضرورت اور اس کی غرض وغایت سے بحث کی جاتی ہے۔باقی شرائط کی تفصیلی بحث انشاءاللہ اس کے بعد ہوگی۔

حسب احکام شرعِ شریف طلاق بالکلیہ شوہر کے اختیار میں ہے۔اگر چہ کہ بعض صورتوں میں مثلاً مرد عنین ہو تو قاضی کو شرعاً حق حاصل ہے کہ بین الزوجین تفریق کر دے۔لیکن عنانت کے سوا اکثر صورتوں میں قاضی کو بھی تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے۔بلکہ جب تک شوہر طلاق نہ دے زوجہ مطلقہ نہیں ہوسکتی۔اور ظاہر ہے کہ جب تک طلاق یا تفریق نہ ہو وہ نکاح ثانی کی مجاز نہیں ہے۔حالانکہ بعض اوقات ایسے ناگزیر حالات پیش آجاتے ہیں اور تعلقات اس قدر ناخوشگوار ہوجاتے ہیں کہ زوجہ کے لئے مطلقہ ہونا یا بحکم قاضی شوہر کی زوجیت سے علیحدہ ہوجانا ضروری ہوتا ہے کیونکہ نہ شوہر سے حسن معاشرت ہی رہتی ہے اور نہ ازدواجی تعلقات ہی باقی رہتے ہیں نہ وہ نکاحِ ثانی کرسکتی ہے۔لیکن اس شدید بلکہ اشد ضرورت کے باوجود نہ شوہر طلاق دیتا ہے نہ قاضی تفریق کرسکتا ہے۔پس ان صورتوں میں عورت گوناگوں تکلیفات میں مبتلا اور مجبور محض رہتی ہے۔

اسی طرح عورت کی تکلیفات میں سے ایک تکلیف دہ صورت مرد کی مفقود الخبری بھی ہے

جس کی وجہ سے عورت سالہا سال بلکہ عمر بھر مبتلائے مصیبت رہتی ہے۔ اگر مرد مفقود الخبر ہوگیا ہے تو اگر چہ امام مالکؒ کے پاس اور بروایتے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے پاس بھی عورت (۴) سال کے بعد بحکم قاضی نکاح ثانی کرسکتی ہے۔ لیکن امام اعظمؒ کے مذہب میں جب تک (۱) مرد کی موت کا یقین نہ ہوجائے یا (۲) اس کے ہم عمر لوگ سب نہ مرجائیں یا (۳) اس کی عمر کے (۹۰) نود سال پورے نہ ہوجائیں، عورت نکاح ثانی کی مجاز نہیں ہے۔ غرض اسی قسم کی مختلف صورتیں ہیں کہ ان کی وجہ سے عورت طلاق کی خواہاں رہتی ہے لیکن طلاق حاصل نہیں کرسکتی۔

لہذا بوقتِ ضرورت عورت کی اسی ناگزیر مجبوری کو دور کرنے کے لئے گروہ مہدویہ میں نکاح علی شرطِ التخیر کا عملدرآمد سلف سے جاری ہے۔ جس کی وجہ سے زوجہ، شوہر کے طلاق دینے کی محتاج نہیں رہتی۔ بلکہ ضرورت سمجھے تو بر بنائے شرط از خود مطلقہ ہوجاسکتی ہے۔ اس شرط پر نکاح کرنا حضرت امام اعظمؒ کا مذہب ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے پاس اس شرط کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مرد، نان ونفقہ بھی نہ دے تو عورت کو قاضی کے پاس رجوع ہوکر طلاق حاصل کر لینے کا اختیار ہے۔ چنانچہ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں لکھا ہے کہ ''**اجمع ثلاثه من الائمه علی جبر الرجل علی تطلیق زوجته اذا لم ینفق علیها**'' یعنی امام مالکؒ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا اتفاق ہے کہ اگر مرد نفقہ نہ دے تو جبراً اس سے طلاق دلائی جائے گی۔

امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں تو نفقہ دینے کے باوجود مرد چار ماہ تک وظیفۂ زوجیت ادا نہ کرے تو عورت بتوسط قاضی مطلقہ ہوسکتی ہے۔ کتاب مذکور میں لکھا ہے کہ ''**والحنابلة یقولون انه اذا عجز عن اتیانها کل اربعة اشهر فان لها ان تطلب طلاقها ویطلق القاضی علیه**''

یعنی حنبلی کہتے ہیں کہ اگر مرد ہر چار ماہ میں وظیفۂ زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہوتو عورت قاضی کے پاس رجوع ہوکر طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہے اور قاضی طلاق دلاسکتا ہے۔ بلکہ مرد چھ مہینے سے زیادہ سفر میں ہوتو امام احمد کے پاس عورت کی درخواست پر قاضی کو تفریق کردینے کا حق حاصل ہے۔ لیکن امام اعظمؒ کے مذہب میں خواہ مرد سفر میں ہو یا حضر میں عدم ادائی نفقہ اور عدم مباشرت، دونوں صورتوں میں قاضی کو بھی طلاق دلانے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ تا آنکہ خود مرد طلاق نہ دے عورت مطلقہ نہیں ہوسکتی۔ البتہ مرد عنین ہوتو قاضی کو تفریق کردینے کا اختیار ہے۔ لیکن اگر ایک مرتبہ بھی وطی ہوگئی ہے اور پھر مدت العمر وطی نہ ہوتو عورت طلاق کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔ خواہ مرد موجود ہو یا سفر میں ہو یا مفقود الخبر

ہو۔ ہر صورت میں قاضی کو بھی تفریق کا حق نہیں ہے۔ البتہ خود عورت نکاح کے وقت طلاق کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھ لے تو امام اعظمؒ کے پاس جائز ہے۔ اور جن صورتوں میں ائمہ ثلاثہ کے پاس قاضی تفریق کرسکتا ہے امام اعظم کو اس سے اختلاف ہے۔ چونکہ یہ حلال وحرام کا معاملہ ہے اور احتیاط امام اعظمؒ کے مذہب پر عمل کرنے میں ہے اسی وجہ سے یہی مذہب امام اعظمؒ ''مہدویہ'' کا معمول بہ ہے۔ چنانچہ یہ شرط جو ہمارے پاس رائج ہے' جس کی بناء پر عورت کو از خود طلاق لے لینے کا اختیار حاصل ہوجاتا ہے۔ حضرت امام اعظمؒ کے مذہب کے موافق ایک اہم کلیہ پر متفرع ہے اور فقہ حنفی کے ایک ضابطہ پر اس شرط کی بنیاد قائم ہے وہ یہ کہ جس طرح طلاق مرد کے ہاتھ میں ہے کہ وہ جب چاہے عورت کو طلاق دے سکتا ہے۔ اسی طرح فقہ حنفی کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ عورت بھی اگر چاہے تو بوقتِ نکاح اپنی طلاق کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنے کی شرط پیش کرسکتی ہے۔ اگر مرد اس شرط کو قبول کرلے تو وہ شرط' شرطِ شرعی بن جاتی ہے۔ جس کی پابندی مرد پر ضروری ہے اور عورت کو اس شرط کے موافق عمل کرنے کا شرعاً اختیار حاصل ہوجاتا ہے چنانچہ درالمختار میں لکھا ہے کہ ''**نکحها علی ان امرها بید ها صح**'' یعنی ''مرد نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ اس کا امر اس کے ہاتھ میں ہے'' (یعنی اپنی طلاق کی آپ مختار ہے) تو یہ شرط صحیح ہے۔

اس کا مطلب یہ کہ یہ شرط' شرعی اور قابل نفاذ ہے۔ اسی شرط کی بناء پر نفقہ ملتے رہنے اور تعلقاتِ زوجیت باقی رہنے کے باوجود بھی ہر وقت اور ہر حالت میں عورت کو مطلقہ ہونے اور مرد سے علیحدہ ہوجانے کا شرعاً حق حاصل ہے۔ علامہ شامی نے ردالمختار میں اس کی مزید وضاحت کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''**مقید اذا ابتدأت المرأة ففالت زوجت نفسی منک علی ا ن امری بیدی اطلق نفسی کلما ارید او علی انی طالق فقال الزوج قبلت اما لوبداء الزوج لا تطلق ولا یصیر الامر الیها**'' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''اس شرط کا عورت کی طرف سے پیش ہونا ضروری ہے۔ یعنی پہلے عورت کو یہ کہنا چاہئے کہ میں نے اس شرط پر تجھ سے نکاح کیا ہے کہ میرا اختیار میرے ہاتھ میں ہے۔ میں جب چاہوں اپنی ذات کو طلاق دے لوں گی اور مطلقہ ہوجاؤں گی۔ اور مرد نے اس شرط کو قبول کرلیا تو اس صورت میں جب چاہے عورت کو مرد سے علیحدہ ہوجانے کا اختیار حاصل ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اولاً یہ شرط عورت کی طرف سے پیش ہو اور مرد اس کو قبول کرلے۔ اس کے برخلاف اولاً ایجاب مرد کی طرف سے ہو اور اس نے کہا کہ'' میں نے اس شرط پر تجھ سے نکاح کیا ہے کہ تیرا اختیار تیرے ہاتھ میں ہے'' اور عورت

نے اس کو قبول کرلیا تو نکاح تو صحیح ہے لیکن شرط صحیح نہ ہوگی۔ یعنی عورت کا اختیار اس کے ہاتھ میں نہیں رہے گا وہ از خود مطلقہ نہ ہو سکے گی۔''

بعض وقت مطلقہ ثلاثہ کو یہ ضرورت پیش آتی ہے اور اس کو اس شرط پر نکاح کرنا پڑتا ہے مثلاً زید نے ہندہ کو تین طلاقیں دے دیں جس کو طلاق مغلظہ کہتے ہیں۔ اس صورت میں اگر وہ پھر زید سے نکاح کرنا چاہے تو جب تک حلالہ نہ ہو جائے یعنی کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے طلاق نہ لے دوبارہ زید سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس کو کسی سے نکاح کر کے اس سے طلاق لینا ضروری ہے تا کہ شوہر اول زید سے نکاح کر سکے۔ لیکن عورت کو اندیشہ ہے کہ نکاح کے بعد یہ دوسرا مرد اپنے وعدہ کے باوجود بھی طلاق نہیں دے گا اس صورت میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ عورت شرط تخیر پر نکاح کرے جس کی وجہ سے وہ از خود مطلقہ ہو سکے گی۔ چنانچہ در المختار میں لکھا ہے کہ ''**ولو خافت ان لا یطلقها تقول زوجتک ''علی ان امری بیدی''** یعنی ''عورت کو اس بات کا خوف ہو کہ مرد طلاق نہ دے گا تو بوقت نکاح عورت یہ کہے کہ'' میں نے تجھ سے اس شرط پر نکاح کیا ہے کہ میرا اختیار میرے ہاتھ میں ہے'' ان فقہی اقوال سے ثابت ہے کہ از روئے شرع شریف نکاح کے وقت عورت کو اپنی طلاق کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنے کا حق حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ جب چاہے از خود مطلقہ ہو جانے کا حق رکھتی ہے۔

جب شریعت اسلامیہ نے اتنی سہولت دی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو اس کی شرعی حق سے محروم کیا جائے۔ مصیبت پوچھ کر نہیں آتی اور اس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ یوم عقد کی خوشی وخرمی میں اس کے حقوق کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ نہیں معلوم اس بے زبان کو جو مسئلہ سے ناواقف ہے یا واقف ہے تو سماج کی بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے اور لب کشائی کی اجازت نہیں ہے کل کیا ضرورت پیش آئے اور اس کو کن کن مجبوریوں سے دوچار ہونا پڑے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مہدویہ میں حضرت امام اعظمؒ کے مذہب کے موافق اس مسئلہ شرعی سے فائدہ اٹھایا جاتا اور عورت کا اختیار اس کے ہاتھ میں رکھا جاتا ہے اور مسئلہ کے موافق اولاً عورت کی طرف سے اس شرط کو پیش کر کے مرد سے اس کی قبولیت کا اقرار کرایا جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسئلہ میں بڑی گنجائش ہے مسئلہ یہ ہے

نکحها علی ان امرها بیدها صح (میرا اختیار میرے ہاتھ میں ہے) اور اس مسئلہ کی رو سے عورت کو مطلقاً کسی شرط کے بغیر اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنے کا حق حاصل ہے۔

لیکن قوم مہدویہ میں عورت کو ایسی آزادی نہیں دی گئی ہے اور عورت کے اختیار کو مطلق نہیں رکھا گیا ہے کہ جب چاہے اپنی ذات کو طلاق دے لے اور مرد سے علیحدہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر عورت کے اس اختیار کو مطلق رکھا جاتا جس کی مسئلہ میں گنجائش ہے تو وہ مرد کی معمولی معمولی لغزشوں اور اس سے خفیف سی نزاع کی صورت میں بلکہ کسی نزاع کے بغیر بھی اپنے اختیار کو استعمال کر سکتی اور مرد سے علیحدہ ہو جا سکتی تھی۔ جس سے امور خانہ داری، تربیت اطفال اور نظام معاشرت میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے بزرگانِ مہدویہ نے بڑی دقت نظر سے کام لے کر یہ احتیاط رکھی کہ عورت کو مطلقاً اختیار نہیں دیا ہے اور اس کو بالکل مطلق العنان نہیں چھوڑ دیا ہے کہ وہ جب چاہے اپنے آپ کو مرد سے جدا کر لے۔ بلکہ اس کے مطلق اختیار کو اس شرط سے مشروط کیا گیا ہے کہ اگر ''مرد حالتِ سفر میں ایک سال اور حالتِ حضر میں چھ مہینے تک وظیفہ زوجیت ادا نہ کرے تو عورت کا اختیار اس کے ہاتھ میں رہے گا۔'' اس شرط کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نکاح کے بعد مرد سفر پر چلا جائے اور ایک سال کے بعد واپس آ کر ایک مرتبہ وظیفۂ زوجیت ادا کر دے۔ یا گھر ہی میں رہے اور چھ مہینے میں کسی وقت بھی ایک بار وطی کر لے تو شرط پوری ہوگئی اور عورت کا اختیار ختم ہو گیا۔ شرط کا یہ مطلب سمجھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں شرط سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا۔ فقہ حنفی کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ مرد نکاح کے بعد خواہ سفر پر جائے یا گھر میں رہے اگر ایک مرتبہ بھی وطی کر لیا ہے تو عورت کا حق ساقط ہو گیا۔ اس کے بعد عمر بھر بھی وطی نہ کرے تو عورت بذریعہ قاضی بھی طلاق حاصل نہیں کر سکتی۔ اس وجہ سے عورت کو یہ شرط عائد کرنی پڑی کہ وطی کا سلسلہ جاری نہ رہے تو حق طلاق اس کو حاصل رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت اپنے حق کا استعمال نہ کرے (اور یقیناً نہیں کرتی) لیکن بہ وقت ضرورت عورت کی اس مجبوری کو دور کرنے کے لئے یہ شرط رکھی گئی ہے۔ پس اس شرط کا منشاء وفحویٰ یہ ہے کہ بحالتِ سفر ہر یک سالہ اور بحالت حضر ہر ششماہی مقاربت کے بعد بھی یہ شرط عائد ہوتی رہے گی اور عورت کا اختیار بدستور باقی رہے گا۔

ایک سال اور شش ماہ کی قید بھی عورت کی طرف سے رعایت مزید ہے ورنہ مسئلہ میں تو بڑی گنجائش ہے۔ اگر وہ ''زوجتک علی ان امری بیدی'' (میں نے اس شرط پر نکاح کیا ہے کہ میرا اختیار میرے ہاتھ میں ہے) کہہ کر عورت مطلق اختیار اپنے ہاتھ میں رکھ لیتی تو اس شرط مطلق کی بناء پر مرد وظیفۂ زوجیت ادا کرتا رہے، نان ونفقہ کی بھی کوئی تکلیف نہ دے اور کسی قسم کی ظلم وزیادتی کا بھی مرتکب نہ ہو۔ تو تب بھی مطلق شرط کی بناء پر عورت کو جب چاہے مرد سے جدا ہو جانے کا اختیار حاصل

رہتا۔لیکن ہمارے بزرگوں نے عورت کو اس قدر بااختیار نہیں رکھا بلکہ نہایت دور اندیشی اور مصلحت بینی سے عورت کے مطلق اختیار کو عدم مقاربت کی ایک مناسب مدت سے مقید کر دیا ہے۔

عدم مقاربت کو شرطِ طلاق قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اگر مقاربت نہ پائی جائے تو اس کی تلافی کسی صورت سے ممکن نہیں ہے۔اور طلاق کے سوا اور کوئی سبیل عورت کے لئے نہیں ہے۔اس کے برخلاف نفقہ' مہر اور دوسرے حقوق اگر شوہر پامال کر رہا ہے تو اس کی تلافی ممکن ہے طلاق ہی لینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عورت چارۂ کار قانونی اختیار کر سکتی اور اپنا حق منوا سکتی ہے۔مثلاً شوہر نفقہ نہ دے تو عورت قاضی کے پاس نالش کر سکتی ہے۔ظلم وزیادتی کا انسداد بھی کسی نہ کسی طرح ممکن ہے۔مہر معجّل ہو تو دعویٰ ہو سکتا ہے لیکن مرد عیش پسند ہے' آوارہ ہے' یا تعدد ازواج کی وجہ سے دوسری زوجات کی طرف مائل ہے۔غرض کسی نہ کسی وجہ سے بددل ہو گیا ہے اور اس کی طرف راغب نہیں ہے' جس کے مختلف وجوہات ہو سکتے ہیں تو اس کا کوئی علاج کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔یہ ایک طبعی فعل ہے تاوقتیکہ طبیعت کا میلان اس طرف نہ ہو قضاۃ' پنچایت' فہمائش غرض کسی صورت سے اس کی سبیل ممکن نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ حسب احکامِ شرع شریف ایک مرد کی کئی بیویاں ہیں تو جملہ امور خانہ داری میں مرد پر عدل ومساوات اور صرف ''شب باشی'' واجب ہے۔مباشرت شرط نہیں ہے۔کیونکہ یہ فعل اس کے اختیار میں نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ ازواجِ مطہرات میں پورا پورا عدل وانصاف ملحوظ رکھنے کے باوجود اس فعل سے متعلق ارشاد فرماتے تھے کہ ''**اللھم ان ھذا قسمی فیما املک فلا تلمنی فیما لا املک**'' یعنی پروردگار! جو کچھ میرے اختیار میں تھا اس میں' میں نے بین الازواج مساوات کر دی اب جو کچھ میرے اختیار میں نہیں ہے تو اس پر مواخذہ نہ فرما!اس فرمان میں اسی فطرت اور رجحان طبیعت کی طرف اشارہ ہے۔

اندریں حالات عورت اگر چاہے تو اس کے لئے بس یہی ایک صورت ہے کہ وہ مرد سے علیحدہ ہو جائے۔اس لئے طلاق حاصل کرنے کے لئے مرد کی دوسری فروگزاشتوں سے قطع نظر کر لیا گیا۔کیونکہ ان کا تدارک بغیر طلاق کے بھی ہو سکتا ہے۔اس وجہ سے صرف عدم مقاربت کو وجہ انقطاع قرار دے کر عورت کے مطلق اختیار کو عدم مقاربت کی ایک مناسب مدت سے مقید کیا گیا ہے۔جس کی بناء پر عورت چاہے تو بوقتِ ضرورت از خود مطلقہ ہو جا سکتی ہے۔

چنانچہ اسی مصلحت کی بناء پر کہ عورت شدید ضرورت اور مجبوری کے وقت بااختیار رہے' مسئلہ

شرعی سے استفادہ کرتے ہوئے حضرت علامہ بندگی عبدالملک سجاوندی عالم باللہؒ نے اس شرط کو آج سے چار سو سال پہلے ایجاب کا جزو قرار دیا ہے۔ یعنی عورت کی طرف سے اس شرط کو پیش کرتے ہوئے مرد سے اس طرح خطاب کیا جاتا ہے کہ ''نفس مسماۃ فلاں بنتِ فلاں رابہ بدل مہر ( ) بایں شرط کہ شش ماہ در حال اقامت ویک سال در حالِ سفر اگر ذات تو بذاتِ مسماۃ مذکورہ نہ رسد اختیار او بدست او باشد' پس بدیں شرط وبدیں مہر بزنی خواستی وقبول کردی؟'' اس کے جواب میں مرد'' خواستم وقبول کردم'' کا اقرار واعتراف کرتا ہے جو شرط اور مہر دونوں کی قبولیت پر حاوی ہے۔

یہ شرط تسہیلاً ہے وجوباً نہیں یعنی اس کا یہ مطلب نہیں ہے اگر یہ شرط نہ پائی جائے تو عورت پر اپنا اختیار کام میں لانا اور مطلقہ ہوجانا واجب ہے۔ بلکہ اس شرط کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت مرد کی طرف سے ہر تکلیف ومصیبت اور ایذا دہی کو برداشت کرسکتی اور اس پر رضا مند ہے تو پھر نزاع وخصومت کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ لیکن ناگزیر حالات کے تحت اگر وہ چاہے تو اس شرط سے فائدہ اٹھاسکتی ہے۔ اگر اس شرط سے استفادہ کی ضرورت نہ پڑے تو اس کے بیان کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ لیکن ضرورت کے وقت اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس شرط کی غرض وغایت ''داشتہ آید بکار'' کے اصول پر مبنی ہے۔

صرف اسی ایک شرط کی رو سے عورت کو مرد سے علحدہ ہوجانے یعنی مرد کے طلاق دینے کے بغیر از خود مطلقہ ہوجانے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ اور باقی تین شرطوں میں یہ حکم نہیں لگایا گیا ہے کہ شوہر ان کی پابندی نہ کرے تو زوجہ کا اختیار اس کے ہاتھ میں رہے گا بلکہ ان کا فائدہ یہ ہے کہ مقدمہ قاضی (ناظم عدالت) کے پاس دائر ہوتو نفقہ مقرر کراسکے گی۔ مہر وصول کرسکے گی وغیرہ۔ پس شرط اول کے سوا کسی شرط کی بھی شوہر پابجائی نہ کرے تو عورت کو مطلقہ ہوجانے کا اختیار نہیں ہے۔ صرف بوقت خصومت حق بجانب زوجہ ہے۔

شرط اول تو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اس کی ضرورت اور افادیت بیان سے باہر ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اکثر ایسی ناخوشگوار صورتیں پیش آجاتی ہیں کہ جن کی وجہ سے عورت' مرد سے علیحدہ ہوجانا چاہتی ہے لیکن طلاق مرد کے ہاتھ میں (اختیار میں) ہونے کی وجہ سے وہ مجبور ہے۔ صرف یہی ایک شرط ایسی ہے کہ اگر اس شرط پر عقد منعقد ہوا ہو تو عورت اس سے استفادہ کرسکتی ہے اور مرد کے دیگر مظالم کے علاوہ عدم مقاربت بھی پائی جاتی ہے تو از خود مطلقہ ہوسکتی ہے۔

اس کے علاوہ بعض خاص خاص صورتوں میں بھی اس شرط سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مثلاً اس شرط پر عقد نہ ہو اور مرد عنین ہو تو عورت کو بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر مرد طلاق نہ دے تو عورت از خود مطلقہ نہیں ہوسکتی بلکہ حسب احکام فقہی عورت کو قاضی کے پاس رجوع ہونا ضروری ہے۔ قاضی مرد کو ایک سال کی مہلت دے گا تا کہ علاج معالجہ کروائے اور یہ بھی مصلحت ہے کہ تینوں موسم اس پر گذر جائیں کیونکہ بعض وقت موسم کے اثرات بھی صحت کو متاثر کر دیتے ہیں۔ ایک سال کے بعد بھی مرد نااہل ہی ثابت ہو اور اس کے باوجود طلاق نہ دے تو قاضی باختیار خود تفریق کر دے گا۔ البتہ اس شرط پر نکاح ہو تو ان مراحل کو طئے کئے بغیر عورت کو اپنے اختیار سے علیحدہ ہوجانے کا حق حاصل ہے۔

عنانت (نامردی) کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ مرد کے عنین ہونے کی وجہ سے عورت عدالت میں رجوع ہو تو قاضی کو تفریق کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ بشرطیکہ ثابت ہوجائے کہ نکاح کے بعد ایک مرتبہ بھی مرد نے وظیفۂ زوجیت ادا نہیں کیا ہے۔ عنانت کی اس صورت میں اس شرط سے فائدہ یہ ہے کہ قاضی کے پاس رجوع ہونے' عدالت کی داد دی اور فضیحت ورسوائی کے بغیر عورت از خود مطلقہ ہوجاسکتی ہے۔

عنانت کی دوسری صورت یہ ہے کہ مرد نکاح کے وقت تندرست ہوتا ہے اور وظیفۂ زوجیت بھی ادا کر چکا ہے لیکن درمیان میں دیوانہ یا مجنون ہوگیا ہے یا کسی جسمانی صدمہ سے یا کسی علت و بیماری سے نامردی عارض ہوجاتی ہے اور گو مرد مدت العمر کے لئے بیکار ہوگیا ہے۔ لیکن اس صورت میں قاضی کو بھی تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ درالمختار میں لکھا ہے کہ ''**فلو جن بعد وصوله اليها مرة اوصار عنينا بعده اى بعد الوصول لا يفرق لحصول حقها بالوطى مرة**'' یعنی ایک مرتبہ کی وطی کے بعد مرد مجنون یا نامرد ہوگیا تو عورت اپنا حق پا چکی اب قاضی تفریق نہیں کرسکتا۔

حاصل یہ کہ عنانت اور جنون کی جن صورتوں میں قاضی کو بھی تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے اور مرد بھی طلاق نہیں دیتا تو عورت اگر چاہے تو اس شرط کی بناء پر از خود مطلقہ ہوجانے کا اختیار رکھتی ہے۔ یعنی جہاں قاضی بھی مرد کی عنانت (نامردی) اور جنون کے باوجود بین الزوجین تفریق کرنے سے شرعاً قاصر ہے وہاں بھی عورت اس شرط سے فائدہ اٹھاسکتی ہے۔ نہ قاضی کے پاس عنانت کی شکایت لیجانا ضروری ہے نہ فیصلہ کے لئے ایک سال کی طویل مدت درکار ہے۔ نہ محکمۂ قضات کی ملازمہ مستورات کے مواجہہ میں تعلقات جنسی کا مظاہرہ کر کے فضیحت ورسوا ہونے کی ضرورت ہے۔ وہ

اگر چاہے تو اس شرط سے کام نہ لے اس پر کوئی جبر ولزوم نہیں ہے۔لیکن اس کی گھریلو زندگی پر ناگوار اثر پڑ رہا ہے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ شیطان اس پر قابو پالے گا اور وہ بدراہی کا شکار ہو جائے اور شوہر طلاق نہیں دے رہا ہے اور یہ طلاق کی خواہاں ہے تو ایسی صورت میں اس شرط سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

عنانت (نامردی) کی صورت تو بہت کم پیش آتی ہے اور یہ شرط خاص اس صورت سے مخصوص بھی نہیں ہے اور نہ صرف اس لئے بیان کی جاتی ہے۔تاہم عنانت اصلی ہو یا درمیان میں عارض ہوگئی ہو دونوں قسم کی نامردی میں یہ شرط بڑے کام کی چیز ہے۔عموماً اختلاف طبائع، شکر رنجی اور ناسازگاری اور مختلف وجوہات کی بناء پر باوجود رجولیت (مردی) واہلیت کے عدم مقاربت کی صورتیں اکثر پیش آتی رہتی ہیں اور ضمناً مختلف تکالیف ومصائب میں عورت مبتلا ہو جاتی ہے۔اگر تعلقات جنسی کے ترک کو وہ برداشت بھی کر لے تو دوسرے ضروریات زندگی اور اسباب معیشت کا فقدان اور روحانی اذیتیں اسکے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔اور ایسے وقت اگر مرد طلاق نہیں دیتا اور نہیں دینا چاہتا تو یہ شرط بڑے فوائد کی حامل ہے۔یعنی عورت کو یہ سہولت حاصل ہے کہ مرد کی دوسری لغزشوں، فروگزاشتوں اور اس کی طرف سے مختلف تکالیف ومصائب سے قطع نظر کر کے اگر چاہے تو صرف عدم مقاربت کی شرط کی بناء پر مرد سے ازخود طلاق حاصل کر لے سکتی ہے۔

یہ تو وہ صورتیں ہیں کہ مرد موجود ہے اور اس کے مواجہہ میں عورت اس سے مطلقہ ہو رہی ہے۔اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ مرد غائب ہے یعنی اپنے مقام پر موجود نہیں ہے لیکن کسی مقام پر زندہ وسلامت رہنے کا علم ویقین ہے مگر اس کی غیبوبت کو ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے تو چونکہ ایک سال تک مقاربت نہیں پائی جاتی لہذا عورت اگر ضرورت سمجھے تو اس شرط سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

اس سے زیادہ ایک تکلیف دہ صورت یہ ہے کہ شوہر مفقود الخبر ہے یعنی اس کی موت وحیات کا کوئی علم ہی نہیں ہے تو اس صورت میں مسئلہ یہ ہے کہ جب تک (۱) مرد کی موت کا یقین نہ حاصل ہو جائے یا (۲) جب تک اس کے ہم عمر لوگ سب نہ مر جائیں یا (۳) اس کی عمر کے نود (۹۰) سال پورے نہ ہو جائیں یہ اسی کی زوجہ متصور ہوگی اور نکاح ثانی نہیں کر سکتی۔اگر یہ شرط ہو تو اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ احیاناً ایسی صورت پیش آ جائے اور عورت چاہے تو اپنے آپ کو مطلقہ قرار دے لے سکتی ہے اور اگر یہ شرط نہ ہو تو وہ مدت العمر مجبور ہے اور قاضی بھی تفریق سے قاصر ہے۔

اگر چہ کہ نفس ایجاب وقبول سے نکاح ہو جاتا ہے مگر عورت ایسے جال میں پھنس جاتی ہے کہ

شدتِ ضرورت کے وقت بھی مرد جب تک طلاق نہ دے مطلقہ نہیں ہوسکتی۔ آج ساری دنیا اسی سادہ نکاح پر عمل پیرا ہے اور حیران و پریشان ہے۔ ہم بھی محض ایجاب وقبول پر اکتفا کریں تو صحت نکاح میں تو کوئی فرق نہیں آتا مگر عورت بالکل بے دست و پا رہتی ہے البتہ دوسرے شرائط سے عموماً اور اس شرط سے خصوصاً عورت کی بے بسی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

قوم کے ہر فرد کو غور کرنا چاہئے کہ جب وہ اپنی لختِ جگر کو کسی کے حوالہ کر رہا ہے تو آئندہ فلاح و بہبود کی فکر اور اس کی سہولت و آسائش کی فکر و تدبیر بھی اس پر لازم ہے۔ ایک بے زبان کے شرعی حقوق کو غصب کر لینا اور اس کی شرعی آزادی کو سلب کر دینا مناسب نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی لڑکی کو حسبِ حیثیت سینکڑوں، ہزاروں کا مال ومتاع جہیز کے نام سے دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے اپنا حق پدری ادا کر دیا۔ لیکن کل کیا افتاد پیش آئے گی اور شوہر کی طرف سے وہ کن آلام ومصائب میں مبتلا ہونے والی ہے اس کے علم میں نہیں ہے اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو اس کی پوری شرعی آزادی کے ساتھ رخصت کیا جائے ورنہ سمجھنا چاہئے کہ باوجود اس تمام جہیز، دان اور اشیائے مایحتاج کی فراہمی کے وہ اپنی چہیتی بیٹی، بہن یا کسی عزیزہ کو قلاش اور مفلس ومحتاج ہی اپنے گھر سے رخصت کر رہا ہے۔

اسی طرح مرشدین کرام پر بھی اپنی مریدہ کے حقوقِ شرعی کے تحفظ کی ذمہ داری کچھ نہ کچھ ضرور عائد ہوتی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ شریعت محمدیہ نے عورت کو جو آزادی، سہولت اور حقوق عطا فرمائے ہیں ان سے عورت کو محروم نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم میں قدیم سے یہ عملدرآمد جاری ہے کہ خطیب نکاح عورت کے مرشد ہی ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ اس حکمت ومصلحت پر مبنی ہے کہ مرشد اپنی مریدہ کے حقوقِ شرعی کی حفاظت کا بطورِ خاص خیال رکھیں گے۔ لیکن یہ عادت اور طریقہ کہ عورت کے مرشد ہی خطیب ہوں آج صرف ایک رسم بن کر رہ گیا ہے اور اصل غرض فوت ہے۔ ''آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند''

حالانکہ تمام شرائط کی عموماً اور اس شرط کی خصوصاً اہمیت اور افادیت ایسی بے نظیر ہے کہ تمام دنیائے اسلام اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ قریبی زمانہ کا واقعہ ہے کہ نواب سرور جنگ جو اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس کی پیشی کے معتمد تھے اور جن کی دیوڑھی چنچل گوڑہ میں اب تک موجود تھی۔ قوم کے مشہور بزرگ حضرت سید صاحب میاں صاحب مرحوم سجادہ دائرہ چنچل گوڑہ کے بہت معتقد تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے اپنے یہاں کا عقد بغرضِ حصول برکت حضرت موصوفؒ سے پڑھوایا۔ مجلس عقد میں حیدرآباد کے علماء، مشائخین اور معززین شہر کا کثیر اجتماع تھا۔ حسب عادت حضرت خطیبؒ نے میاں

عالم باللہؒ کا خطبہ پڑھا اور جب نوشاہ سے خطاب فرمایا کہ'' **مسماۃ فلاں بنتِ فلاں را بہ بدل مہر( ) بایں شرط کہ شش ماہ در حال حضر ویک سال در حال سفر اگر ذاتِ تو بذاتِ مسماۃ مذکورۃ نہ رسد اختیار او بدست او باشد۔ پس بدیں شرط وبدیں مہر بزنی خواستی وقبول کردی؟** تو ساری محفل پھڑک اٹھی اور اکثر لوگوں کی زبان سے بیساختہ نکل گیا کہ کاش یہ شرط ہمارے پاس بھی رائج ہوتی۔ ۱۹۷۶ء میں حیدرآباد میں ایک شادی کے موقع پر ایسا ہی واقعہ پیش آیا جب کہ اہل دائرہ نو حضرت میانجی صاحب خلف حضرت اشرف میاں صاحبؒ نے خطبۂ نکاح میں ان شرائط کا اعادہ کیا تو فاضل وتبحر محترم عبدالوہاب بخاری صاحب ناظم دائرۃ المعارف نے قاری النکاح کو بے ساختہ گلے لگالیا اور یہ کہتے ہوئے مبارک باد دی کہ ایسا جامع خطبہ نکاح انہوں نے آج تک نہیں سنا۔

سچ فرمایا سعدی علیہ الرحمہ نے کہ

نزدیکانِ بے خبر دور ودورانِ بابصر نزدیک

کسی قوم کی نکبت اور انحطاط' تنزل کی پہلی علامت یہ ہے کہ وہ قوم اپنی ہر اچھی چیز کو بُری اور دوسری قوم کی ہر بُری چیز کو اچھی سمجھنے لگتی ہے۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ انہی شراط نکاح کو لیجئے کہ یہ چاروں شرطیں گویا جواہر پارے ہیں جن کی قدر و قیمت وہی جانتے ہیں جو'' جوہر شناس'' ہیں

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ہم دین ودانش سے دور ہیں اور تفقہ وتدبر ہم میں ناپید ہے۔ بزرگوں کی تحقیق کو سمجھنا اور اس کو سنبھالنا تو کجا؟ ہماری عقل نارسا ان شرائط کو از کار رفتہ سمجھتی ہے

دیدۂ کو رکو 'کیا آئے نظر کیا دیکھے؟

انتہا یہ ہے کہ ان شرائط کو حدودِ شریعت میں داخل کرنے اور دائرہ تہذیب میں جگہ دینے میں بھی ہم کو تامل ہے۔ دوسری شرطوں پر بحث تو آگے آرہی ہے فی الوقت شرط اول پر بحث چل رہی ہے جس کے بارے میں ایک آواز یہ اٹھی تھی کہ یہ تہذیب سے گری ہوئی ہے۔ اس شرط کا متن یہ ہے۔ '' اگر ذاتِ تو بذاتِ مسماۃِ مذکورہ نہ رسد پس اختیارِ او بدستِ او باشد'' اس اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بے حیائی کی باتیں مجلس عقد میں نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی' دوسرا حقیقی۔ الزامی جواب یہ ہے کہ اس شرط کی تہذیب پر اعتراض

کرنے والے اصحاب غور فرمائیں کہ دورِ حاضر میں ''تہذیب'' ایک شئے عنقا صفت کا نام ہے۔ صدہا سال کی طویل مدت میں کسی نے اس شرط کو بدتہذیبی کا نام نہیں دیا۔ اور آج اس دور میں جس سے ہم گذر رہے ہیں ہر عیب ہنر اور ہر بے حیائی تہذیب بن چکی ہے۔

یورپ اپنی عورتوں کو آزادی دے کر نالاں وگریاں ہے اور اب بات اس کے قابو سے نکل چکی ہے۔ اور وہاں عورتوں کے تعلق سے جو ابتری پھیلی ہوئی ہے اب اس کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔ یورپ کے اس پشیمانی سے سبق حاصل کرنے کے بجائے یورپ کی اندھی تقلید کو ہم سب مسلمانوں نے بھی اپنالیا ہے مردوں کو اور ان کی رفتار وکردار کو چھوڑیئے اس پر پھر کبھی گفتگو ہوگی' فی الحال عورتوں کے تعلق سے صرف اس قدر عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ ناٹک' سینما' سرکس' میوزیم' اگزیبیشن' شاپنگ' نیم عریانی' بے پردگی' کالج کی مخلوط تعلیم' بازاروں کی گشت' بسوں کی نشست اور اس آزادی سے پیدا ہونے والی جملہ خرابیوں کو ہم روشن خیالی سے تعبیر کرتے اور بخندہ پیشانی برداشت کرتے ہیں۔ حالانکہ مذکورہ صورتوں میں سے جو ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہیں ہر صورت اس شعر کی مصداق ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہئے؟

مطلب یہ ہے کہ ہم اس حال میں خوش ہیں اور ہر بے حیائی کو بطیّب خاطر نہایت صبر وضبط سے برداشت کرنے کے عادی ہورہے ہیں اور روزانہ ہماری قوتِ برداشت بڑھ رہی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ اس صورت میں صرف مردوں کی مجلس میں خدا ورسول کا حکم سننے کو جس میں فحش صریح بھی نہیں ہے ہم برداشت نہیں کرسکتے؟ العجب ثم العجب

اس اعتراض کا حقیقی جواب یہ ہے کہ ہر چیز کا حسن وقبح ہماری عقل وسمجھ پر نہیں ہے۔ بلکہ خدا ورسول کے حکم پر موقوف ہے۔ خدا ورسول جس چیز کو اچھی کہیں وہ اچھی۔ اور جس کو بُری کہیں وہ بُری۔ اسی طرح خدا ورسول کے احکام کی تبلیغ بھی خواہ کسی نوعیت کے ہوں مستحسن ہے' مذموم ومقبوح نہیں ہوسکتی۔ نکاح وطلاق اور مرد اور عورت کے باہمی تعلقات سے متعلق ہزاروں مسائل سے قرآن وحدیث اور کتبِ فقہ بھرے ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھنا' پڑھانا' ان کا درس وتدریس' ان کی تعلیم وتبلیغ محض اس لئے بند نہیں کی جاسکتی کہ یہ احکام ومسائل خلافِ تہذیب ہیں۔ آخر ان کو بیان کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ اور عوام ان سے کس طرح واقف ہوسکیں گے۔ دین رسول اللہ ﷺ تو اصحابِ کرام ہی سے پھیلا۔ لیکن ازواج مطہرات اور دیگر صحابیات نے بھی اس میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ دوسرے امہات

المومنین کے علاوہ صرف ام المومنین حضرت مقدسہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے (۲۲۱۰) حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے اکثر عورتوں کے مسائل' گھریلو حالات اور جنسی تعلقات پر مشتمل ہیں۔ احادیث کے اس ذخیرہ سے جن میں عورتوں اور مردوں سے متعلق نازک سے نازک احکام ومسائل بیان کئے گئے ہیں' ان کی نشر واشاعت کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ عام لوگ تو عربی نہیں جانتے اس لئے عوام کی واقفیت کے لئے ان احکام ومسائل کو جو دین کا ضروری جزو ہیں فارسی یا اردو میں منتقل کرنا ہی پڑے گا۔ البتہ ہر زبان میں کسی مفہوم کو ادا کرنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں ان میں سے فحش وعریانی کو چھوڑ کر کسی شائستہ طریقہ بیان کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان کو قطعاً ترک تو نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ترک کیا جائے تو خدا اور رسول کے احکام کی تبلیغ کس طرح ہوگی؟

حضرت عمر فاروقؓ اپنے زمانۂ خلافت میں رات کے وقت مدینہ منورہ کی گشت فرما رہے تھے۔ ایک گھر سے کسی عورت کے عشقیہ اشعار گانے کی آواز آئی جس کا شوہر جہاد پر گیا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ اسی وقت اپنی صاحبزادی' حرم محترم رسول اللہ ﷺ ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس آئے اور دریافت کیا عورت' مرد کے بغیر کتنے روز تک ٹھیر سکتی ہے۔ انہوں نے شرم سے گردن جھکالی۔ فرمایا حفصہ! شرم کی کیا بات ہے؟ خدائے تعالیٰ حق بات سے نہیں شرماتا' تم کو جواب دینا پڑے گا۔ حضرت حفصہؓ نے منہ پھیر لیا اور ہاتھ کی چار انگلیاں آگے بڑھادیں۔ مطلب یہ تھا کہ عورت چار ماہ تک صبر کرسکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے احکام جاری کردیئے کہ کوئی مجاہد چار مہینے سے زیادہ جہاد پر نہ رہے۔ ہر چار ماہ میں سپاہیوں کے تبادلے ہوتے رہیں۔

غرض یہ کہ حق گوئی فرض ہے' خواہ حضرت حفصہؓ کی طرح اشارہ وکنایہ ہی سے حق ظاہر کیا جائے۔ پس شرطِ زیر بحث میں بھی وطی' صحبت' مباشرت' مقاربت' مجامعت وغیرہ بیشمار الفاظ کو چھوڑ کر حضرت عالم باللہؒ نے اس شرط کے مفہوم کو جس عبارت میں اور جس لباس وکنایہ میں اور جن سنجیدہ الفاظ میں ادا فرمایا ہے اس کا جواب نہیں ہوسکتا۔ اس سے بہتر یا زیادہ مناسب پیرایہ اور اس سے زیادہ شائستہ انداز بیان ممکن نہیں ہے۔ پس یہ شرط مجلس شرفائے کرام میں بلا تامل کہی جاسکتی ہے۔

الغرض یہ شرط نہایت کارآمد اور ضروری ہے۔ اس کو حسب عملدرآمد قدیم ایجاب وقبول کا جزو قرار دینا چاہئے۔ جس طرح کہ حضرت میاں عالم باللہؒ کے خطبہ میں ہے۔ یا حضرت شاہ قاسمؒ کے خطبہ کے موافق بوقت ایجاب چار شرائط کی قبولیت کا بالاجمال اقرار لیا جائے۔ یا دستاویز نکاح میں یہ

شرط اور دوسری شرائط درج ہوں۔

قوم کے ذمہ دار اور سربرآوردہ اصحاب اور ارباب فکر ونظر پسند کریں تو ان شرائط پر عمل کرنے اور ان کو پوری قوم کے لئے حسب عملدرآمد قدیم لازمی قرار دینے کی بہترین صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عقد خوانیوں کی یادداشت میں دوسرے ضروری امور متعلقات نکاح کے علاوہ اس شرط کا اور نیز دوسرے شرائط کا بھی اندراج کیا جائے۔ جس پر ''نوشاہ'' دلہن کے ولی یا سرپرست' خطیب' گواہ اور وکیل کے دستخط ثبت ہوجائیں گے۔ اس صورت میں خطبۂ نکاح کے وقت اگر'' بچہار شرط شرعی بزنی خواستی وقبو ل کردی'' پر بھی اکتفا کیا جائے تو کافی ہے۔ شرائط کے اعادہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ اعتبار دستاویز نکاح کا ہے جس پر پہلے ہی سے دستخط ثبت ہیں۔ اس سے عورت بوقت ضرورت فائدہ اٹھاسکتی ہے۔ غرض اس شرط سے غفلت کرنا' اس کو معیوب اور غیر ضروری سمجھنا' عورت پر ظلم کرنے اور اس کے شرعی حق سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

اس شرط سے عورت پر مرد کو جو اقتدار حاصل ہے' اس کا ابطال مقصود نہیں ہے حضرت عالم باللہؒ اور حضرت شاہ قاسمؒ نے اس کو ملحوظ رکھا ہے۔ عورت پر مرد کا اقتدار مسلم ہے۔ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے ''**الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم**'' یعنی'' عورتوں پر مرد حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک پر ایک کو فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتا ہے''

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے عورتوں پر مرد کو حاکم اور نگراں بنایا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ نے علم وعمل کے اعتبار سے عورتوں پر مردوں کو فضیلت دی ہے اور یہ فضیلت عطائے الٰہی ہے۔ دوسری وجہ فضیلت مردوں کا احسان ہے کہ وہ اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ مثلاً نان ونفقہ دیتے' مہر ادا کرتے اور ان کی ضروریات زندگی اور اسباب معیشت کو فراہم کرتے ہیں۔ ان دونوں وجہوں سے عورتوں پر مرد کی اطاعت وفرمانبرداری واجب ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی کی آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ'' نیک عورتیں مردوں کی اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوتی ہیں۔ اور جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے وہ شوہر کے غیاب میں اپنی آبرو کی اور اس کے مال کی حفاظت کرتی ہیں'' یعنی اپنی ذات میں اور شوہر کے مال میں خیانت نہیں کرتیں۔

ہندوستان کے علماء میں مولوی ابوالکلام آزاد' مولوی مودودی صاحب نے نصوص صریحہ اور

احادیثِ شریفہ سے صرف نظر کر کے عورتوں اور مردوں کی مساوات کا نظریہ قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہا اور لکھا ہے کہ ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ یوسف کی تفسیر میں ابوالکلام آزاد نے لکھا کہ ''قرآن میں کہیں ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے جس سے مترشح ہوتا ہو کہ عورت کی جنس مرد سے فروتر ہے'' (ترجمان القرآن جلد۲ صفحہ ۲۶۷)

مودودی صاحب نے بھی اسی سورہ کی تفسیر میں معہ شئی زائد اسی اصول کو اپنا لیا ہے۔ آیت کریمہ **الرجال قوامون علی النساء** (مردوں کو عورت پر فضیلت ہے) کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب ترجمان القرآن نے بڑی پر پیچ بحث کی اور جناب مودودی نے تو صاف لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے فضیلت سے مشرف' کرامت وعزت کا ارادہ نہیں فرمایا (تفہیم القرآن جلد ا صفحہ ۳۴۹)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدائے تعالیٰ نے فضیلت کا لفظ استعمال کر کے بھی شرف وفضیلت کا ارادہ نہیں فرمایا بلکہ علم الٰہی میں ایسے معنی مراد ہیں جس سے فضیلت کی نفی ہوتی ہے۔ حالانکہ سلف صالحین نے تو اس آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مرد عورت کا رئیس اور حاکم ہے۔ عورت کجروی کرے تو مرد تادیباً سزا بھی دے سکتا ہے کیونکہ وہ عورت سے اشرف وافضل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت اور بادشاہت مردوں کے لئے خاص کی گئی (تفسیر ابن کثیر)

اس آیت کا شان نزول بھی یہی ہے کہ مرد کو عورت پر برتری ہے۔ ایک مرتبہ حضرت سعد بن الربیعؓ نے اپنی بیوی حبیبہ کو کسی نافرمانی پر تھپڑ مار دیا انہوں نے اپنے باپ زیدؓ کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شوہر کی شکایت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حبیبہ! تو بھی اس سے بدلہ لے لے۔ وہ ابھی راستہ میں تھیں کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ **الرجال قوامون علی النساء** رسول اللہ نے باپ' بیٹی کو واپس بلایا اور فرمایا ہم نے کچھ چاہا تھا اللہ نے دوسری بات چاہی اللہ نے جو کچھ چاہا وہی بہتر ہے۔ (روح المعانی وغیرہ) دیکھئے مرد اور عورت کی مساوات کا نظریہ یہاں ٹوٹ رہا ہے۔

یہی مفسرین جب اس آیت کریمہ پر گزرے'' **للرجال علیھن درجہ**''یعنی مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے تو صاحب تفسیر ترجمان القرآن اور صاحب تفسیر تفہیم القرآن دونوں بھی یہاں سے خاموش گزر گئے۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ درآں لیکہ اس آیت سے مردوں کی عورتوں پر فضیلت وفوقیت صاف مترشح ہے۔ پھر تامل کیوں ہے؟

امام بخاری نے باب **کفران العشیر** میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

''میں نے نہایت مہیب منظر دیکھا کہ دوزخ میں عورتوں کو زیادہ پایا صحابہ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کفر کی وجہ سے۔صحابہ نے عرض کیا کیا وہ خدا کی منکر ہیں؟ فرمایا نہیں بلکہ وہ اپنے شوہروں کی نافرمانی کرتی ہیں اور احسان فراموش ہوتی ہیں (یعنی یہ بھی کفر ہے) فرمایا اگر تم تمام عمر کسی عورت پر احسان کروگے اور پھر تم سے کوئی بات ناگواری کی کی جائے تو کہے گی کہ میں تجھ سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی''

امام موصوف نے دوسرے مختلف ابواب بخاری میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید کے بعد عورتوں کے مجمع میں تشریف لے گئے اور فرمایا۔

''تم لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے میں اہتمام کرو کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں میں زیادہ تر عورتیں ہیں۔عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا تم ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتی ہو اپنے شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔تم عقل و دین میں ناقص ہونے کے باوجود بھی مرد کو تباہ کردیتی ہو جو عقل و دین میں کامل ہے۔عورتوں نے عرض کیا ہمارے دین و عقل میں کیا نقصان ہے۔فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے عورت کی شہادت کو مرد کی شہادت کا آدھا نہیں قرار دیا؟ عورتوں نے کہا یہ صحیح ہے۔فرمایا یہ عقل کا نقصان ہی تو ہے پھر فرمایا حیض کے دنوں میں تم نماز اور روزہ سے محروم نہیں ہوجاتیں؟ عرض کیا یہ بھی صحیح ہے۔فرمایا یہ دین کا نقصان ہے''

مرد اور عورت کی ہر درجہ میں مساوات ثابت کرنے والے اصحاب یہ اور دوسری احادیث کی روشنی میں اور اس فطری اور قدرتی تفاوت کو پیش نظر رکھ کر غور فرمائیں کہ ان کا نظریہ کہاں تک صحیح ہے؟

پس اس شرط کا یہ مقصد نہیں ہے کہ مرد کا اقتدار متاثر کیا جائے یا عورت مرد کی ناشکر گزاری کی مرتکب ہو۔عورت نے تو اپنا مطلق اختیار بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا اور یہ شرط بھی پیش نہیں کی کہ:

اطلق کلما ارید ''میں جب چاہوں گی مطلقہ ہوجاؤں گی''

یہ مطلق اختیار شرعاً جائز و نافذ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صورت بعض وقت خللِ عظیم کا باعث ہوتی ہے جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے۔

یا پھر یہ شرط پیش کرسکتی تھی کہ اگر مرد دوسرا نکاح کرے گا' یا سفر پر لے جائے گا' یا نان نفقہ نہ دے گا یا مہر کی ادائی میں تامل کرے گا روحانی وجسمانی تکلیف دے گا وغیرہ وغیرہ تو۔''میرا اختیار

میرے ہاتھ میں رہے گا''

لیکن عورت نے مطلق اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا نہ کسی جزئی وفروعی اور گھریلو اختلافات کو شرط طلاق قرار دیا۔ بلکہ مرد کے گوناگوں مظالم اور اس کی ایذا رسانی عورت کے لئے ناقابل برداشت ہوجائے اور ازدواجی تعلقات بھی باقی نہ رہیں تو ''شش ماہ درحضر و یک سال درسفر'' کی شرط کا سہارا لے کر اگر وہ چاہے تو اپنی گلوخلاصی کرسکتی ہے اور یہ بھی اس پر واجب ولازم نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی اسی طرح صبر وشکر سے گزار دے تو عند الناس مشکور اور عنداللہ ماجور ہوگی اور اگر وہ ضرورت سمجھے تو اس شرط سے فائدہ بھی اٹھاسکتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حسبِ احکام شرع شریف عورت نکاح کے وقت اپنی طلاق کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھ سکتی ہے۔ اگر وہ اپنے حق کو استعمال کرنا چاہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ بر بنائے شرط اپنے مطلقہ ہونے کا اعلان کردے۔ اگر شوہر کو اس شرط کا اقرار واعتراف ہے تو کوئی نزاع ہی باقی نہیں ہے۔ زوجہ شوہر کے طلاق دینے کے بغیر ہی مطلقہ ہوجائے گی۔ اگر احیاناً شوہر کو اس سے انکار ہے تو بارِ ثبوت عورت کے ذمہ ہے وہ رفعِ نزاع کے لئے قاضی کے پاس رجوع ہوگی۔ چنانچہ فتاوی عالمگیریہ میں لکھا ہے۔ ''**دعوی المراة علی رجها انه جعل امرها بیدها لا تسمع امالو طلقت المرأة نفسها بحکم الامر ثم ادعت وقوع الطلاق ووجوب المهر بنا علی الامر تسمع**'' ترجمہ: یعنی ''عورت نے شوہر پر یہ دعویٰ کیا کہ اس نے میرا اختیار میرے ہاتھ میں دیدیا ہے تو یہ دعویٰ مسموع نہ ہوگا (یعنی قاضی اس درخواست پر کوئی کاروائی نہ کرے گا) البتہ عورت شرط کے موافق اپنے آپ کو طلاق دے کر یہ دعویٰ کرے گی کہ بر بنائے شرط میں مطلقہ ہوگئی ہوں لہذا وقوع طلاق اور وجوب مہر کا حکم دیا جائے تو مسموع ہوگا''

درالمختار میں بھی لکھا ہے کہ ''**لو ادعت حجله امرها بیدها لم تسمع الااذا طلقت نفسها بحکم الامر ثم ادعة فتسمع**'' یعنی ''عورت نے دعویٰ کیا کہ میرے شوہر نے میری طلاق کا مجھے اختیار دیدیا ہے تو اس دعویٰ کی سماعت نہ ہوگی۔ البتہ اس شرط کی بناء پر عورت اپنی ذات کو طلاق دے کر دعویٰ کرے گی تو مسموع ہوگا''

ان فقہی اقوال کا مطلب یہ ہے کہ اگر فی الواقع اس شرط پر نکاح ہوا تھا کہ عورت کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہے اور اب وہ اس شرط کی بنا پر مرد سے علیحدہ ہوجانا چاہتی ہے تو اس پر عمل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً عورت اپنی ذات کو طلاق دے لے اور مطلقہ ہوجائے۔ اس کے اعلانِ طلاق اور

اظہار علیحدگی کے بعد اس شرط کی بناء پر مرد کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ اگر فرضاً وتقدیراً مرد کو اس شرط سے انکار ہے کہ اس شرط پر نکاح نہیں ہوا تھا تو اس صورت میں عورت کو قاضی کے پاس رجوع ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں شرعی اور قانونی نزاکت یہ ہے کہ عورت قاضی کے پاس یہ دعویٰ نہ کرے کہ اس شرط پر نکاح ہوا تھا لہذا تفریق کر دی جائے یا مجھے طلاق دلائی جائے۔ اگر دعویٰ کی یہ نوعیت ہوگی تو دعوی قابل سماعت نہ ہوگا۔ بلکہ دعویٰ کی نوعیت یہ ہونی چاہئے کہ عورت اپنے آپ کو طلاق دے کر قاضی کے پاس بایں غرض رجوع ہو کہ اس شرط کی بناء پر میں مطلقہ ہو چکی ہوں لیکن شوہر کو انکار ہے لہذا وقوع طلاق کا حکم لگایا جائے اور ادائی مہر کی ڈگری دی جائے۔ اس عرضی پر دعویٰ قابلِ سماعت ہوگا اور اس درخواست پر قاضی عورت سے ثبوت طلب کرے گا۔ اگر عورت دو گواہوں سے اس شرط کا ثبوت دے گی تو قاضی وقوعِ طلاق کی توثیق کر دے گا اب زوجہ بالکلیہ مطلقہ ہے۔ شوہر کو کسی قسم کا حق واعتراض نہیں ہوسکتا۔ اگر اس کو پھر بھی کوئی اعتراض ہو تو شرعاً اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ ختم عدت کے بعد عورت قطعاً آزاد اور خود مختار ہے۔

حضرت بندگی میاں شاہ قاسم مجتہد گروہؒ نے اپنے مرتبہ خطبہ میں اس شرط کے علاوہ کہ ''عورت کا اختیار ایک خاص صورت میں اس کے ہاتھ میں رہے گا'' اور تین شرطیں اضافہ فرمائی ہیں جو نہایت مفید اور پر از حکمت ومصلحت ہیں اور ایسی جامع ومانع ہیں کہ ان میں کمی وبیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ ولو بالفرض کچھ کمی کی جائے تو کوئی نہ کوئی فائدہ تلف ہوگا اور کچھ زیادتی کی جائے تو تحصیل حاصل ہوگی۔ چنانچہ شرط مذکور ''اختیار او بدست او باشد'' کے علاوہ جو میاں عالم باللہؒ کے خطبہ میں ہے۔ حضرت شاہ قاسمؒ نے اس شرط سے اتفاق فرماتے ہوئے مزید جن تین شرطوں کا اضافہ فرمایا ہے وہ پہلی شرط کے بعد نیچے لکھی جاتی ہیں۔

(۱) شش ماہ در حالِ اقامت ویک سال در حالِ سفر اگر ذاتِ تو بذاتِ مسماۃِ مذکورہ نہ رسد' اختیار او بدست اوباشد

(۲) از نان ونفقہ یعنی از خرچِ لابدی بکسے عنوان زن را محتاج نہ دارد۔ احیاناً احتیاجے افتد امورِ بیرونی ہمچوں آب وہیزم وسودائے بازار وغیرہ خودبیارد وزن را درستر دارد وبہ ہیچ وجہ از جانبِ خود ایذا نہ رساند

(۳) وقتیکه زن مهر خود طلب کند بلا عذر بدہداگر موجود نه باشد وعده کند یا معاف کناند بہرحال رضامندئ زن حاصل کند

(۴) از دائره دین حتی المقدور زن را بیروں نه برد واز رفتن بخانۂ والدین مانع نه شود

ان شرائط کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) نکاح کے بعد ایک جگہ مل کر رہنے کی صورت میں ہر چھ مہینے میں اور سفر پر جانے کی صورت میں ایک سال تک وظیفۂ زوجیت ادا نہ کرے تو عورت کا اختیار اس کے ہاتھ میں رہے گا یعنی اگر وہ چاہے تو از خود طلاق لے لینے کا اختیار اس کو حاصل رہے گا۔

(۲) نان ونفقہ دیتا رہے۔عورت کو پردہ میں رکھے تکلیف نہ دے

(۳) عندالطلب مہر ادا کرے یا ادا کرنے کا وعدہ کرے یا معاف کرالے۔

(۴) حتی الامکان دائرہ دین میں رکھے۔اور والدین کے گھر جانے سے منع نہ کرے۔

ان مذکورہ چار شرطوں کے منجملہ صرف پہلی شرط کی رو سے عورت کو طلاق کا اختیار حاصل ہے۔باقی تین شرطوں میں یہ حکم نہیں لگایا گیا ہے۔ان سے فائدہ یہ ہے کہ محکمہ قضاۃ یا پنچایت میں فیصلہ عورت کی طرف ہوگا یعنی حسب شرائط وہ اپنا حق منوا سکتی ہے۔

اس سے قبل شرط اول کے تعلق سے ضروری مباحث اور اس شرط کی ضرورت وافادیت پر مختصر گفتگو ہو چکی ہے۔اب علی الترتیب باقی تین شرطوں کے بارے میں کچھ لکھا جاتا ہے۔

<u>شرط دوم</u>: زوجہ کے نفقہ اور اس کے خانگی ضروریات سے متعلق ہے۔فقہ میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ شوہر پر زوجہ کا نفقہ واجب ہے۔فتاوی عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ ''**یجب علی الرجل نفقة امراته**'' یعنی مرد پر اپنی زوجہ کا نفقہ واجب ہے۔اگر شوہر نفقہ نہ دے تو زوجہ کو قاضی کے پاس رجوع ہو کر نفقہ مقرر کرا لینے کا حق حاصل ہے۔کیونکہ از روائے شرع زوجہ کا کھانا' کپڑا' اور سکونتی مکان یہ تینوں چیزیں شوہر پر واجب ہیں اور جب نفقہ کہا جاتا ہے تو اس سے یہی انواع ثلثہ مراد ہوتے ہیں۔اور کتب فقہ میں ان پر نہایت تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر چیز مرد پر کس نوعیت کی اور کس مقدار میں واجب ہے۔اس تفصیل کا ایک نہایت معمولی نمونہ یہاں بیان کیا جاتا ہے جس سے مسائل شرعیہ کی وسعت وجامعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔لباس اور مکان کو چھوڑ کر عورت کے کھانے پینے اور ضروریاتِ مایحتاج کی سربراہی

کے ضمن میں صرف پانی فراہم کرنے کے تعلق سے ائمہ مجتہدین کے مذہب میں جو صراحت ملتی ہے وہ دیدنی ہے۔ باہر سے پانی لانا سب کے پاس مرد کے ذمے ہے۔ چنانچہ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں امام اعظمؒ کا مذہب یہ لکھا ہے کہ "**وعلیه ان یحضر لها الماء الکافی للغسل والوضوء والنظافة**" یعنی "غسل، وضو اور دھونے دھلانے کے لئے پانی لانا مرد کے ذمہ ہے۔

امام مالکؒ کا مذہب یہ لکھا ہے کہ "**ویفرض علیه الماء الکافی لشربها وغسلها للنظافة وللجنابة وغیر ذلک وغسل ثوبها**" یعنی "پینے، دھونے اور غسل جنابت وغیرہ کے لئے کافی مقدار میں پانی فراہم کرنا مرد پر لازم ہے۔ اور عورت کے کپڑوں کی دھلوائی بھی مرد کے ذمہ ہے۔"

امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ " **یجب علیه الماء اللازم للشرب والنظافة والاغتسال منه**" یعنی "پینے کا پانی، صفائی ستھرائی اور نیز صرف اس غسل کے لئے پانی لانا مرد پر لازم ہے جو کہ مرد کی وجہ سے عورت پر واجب ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے پاس مرد صرف غسل جنابت کے لئے پانی فراہم کرے گا کیونکہ عورت پر غسل مرد کی وجہ سے واجب ہوا ہے۔ لیکن حیض ونفاس اور احتلام سے عورت کو غسل کرنا ہے تو پانی فراہم کرنا مرد پر لازم نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب یہ ہے کہ "**ویجب علیه ان یجلب الماء اللازم لنظافتها وغسلها ووضوئهاو شربها**" یعنی "نظافت وپاکیزگی، غسل ووضو اور پینے کے لئے ضروری حد تک پانی لانا مرد کے ذمے ہے۔" شریعت کی ہمہ گیری اور جامعیت کا یہ عالم ہے کہ صرف پانی کی فراہمی کی تفصیل اوپر گذر چکی کہ کس قدر اور کس کام کے لئے پانی لانا مرد کے ذمہ اور کس کام کے لئے پانی لانا مرد کے ذمے نہیں ہے۔

اسی طرح یہ سوال بھی قدرتی طور پر دل میں پیدا ہوسکتا تھا کہ آخر عورت کے کپڑوں کی واشنگ کس کے ذمے ہے۔ تینوں ائمہ کے پاس خود عورت اس کی ذمہ دار ہے۔ لیکن امام مالکؒ نے فرمایا کہ یہ ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے اور اسی مذہب مالکی کو ہمارے بزرگوں نے اپنالیا ہے چنانچہ بعض نسخوں میں شاہ قاسمؒ کی مرتبہ شرطوں میں "**جامه ششتن**" کے جو الفاظ آئے ہیں وہ اسی مسئلہ شرعی کی طرف اشارہ ہے۔ جس کو سننا بھی ہم گوارا نہیں کرتے۔ یا تو ہماری رگِ حمیّت جنبش میں آجاتی ہے یا شرم وندامت سے پانی پانی ہوجاتے ہیں۔

ہمارے یہاں نان ونفقہ کی شرط کے ساتھ دوسرے اشیائے مایحتاج سے قطع نظر کرکے صرف پانی اور لکڑی وغیرہ کی فراہمی کا ذکر کیا گیا ہے اس کی اصلی غرض یہی ہے کہ عورت کو پردہ میں رکھے اور باہر

کا کام خود انجام دے۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے درمیان امورِ خانہ داری کی تقسیم کردی تھی کہ گھر کے اندرونی کام بی بی فاطمہؓ کے ذمہ اور باہر کے کام حضرت علیؓ کے تفویض فرمائے تھے۔ اسی اصول پر فقہا نے بھی مرد اور عورت کی ذمہ داریوں کو بالتفصیل گنایا ہے۔ آج ہم اپنی معاش ومعیشت پر قیاس کر کے ان شرعی مسائل کو غیر ضروری نہیں قرار دے سکتے۔ اگر فضل خدا شامل حال ہے اور ان ذمہ داریوں سے کوئی سبکدوش ہے تو اس کو ان شرائط سے خفّت وخجالت کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو تو خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس ذمہ داری سے اس کو بری الذمہ کر دیا ہے۔ لیکن ہر شخص امیر ومستطیع نہیں ہوسکتا۔ ایک مفلس وبے نوا جو اسی ملت مرحومہ کا ایک فرد ہے۔ اس پر تو یہ شرط ضرور لاگو ہوگی کہ وہ بازار سے پانی اور لکڑی خود لائے۔

اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ شرعی احکام دنیا بھر میں بسنے والے تمام مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ صرف شہر حیدرآباد میں رہنے والے چند لاکھ مسلمان اس کے مخاطب نہیں ہیں۔ ان میں سے بھی اگر چند گھروں میں پانی کی فراوانی ہے یا بعض گھروں میں لکڑی کی بھی ضرورت نہیں ہے، برقی چولہوں پر پُخت وپُز ہو رہا ہے اور شہر میں جا بجا واشنگ کمپنیاں اور بڑی بڑی لانڈریاں موجود ہیں تو ان پر تو یہ شرط لاگو نہیں ہوسکتی۔ لیکن روئے زمین پر بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کو تو یہ سہولت حاصل نہیں ہے۔ سرزمین عرب کے ریگستانوں اور آفریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں کو چھوڑیئے، جہاں منزلوں پانی نہیں ملتا۔ حیدرآباد سے چند میل دور بعض دیہات وقریات میں پانی اور لکڑی کی کس قدر قلت ہے؟ وہاں میاں بیوی میں اگر آب وہیزم کی فراہمی میں نزاع ہو تو شرعی فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ شریعتِ محمدیہ یہ ذمہ داری مرد ہی پر عائد کرے گی کہ باہر کے ضروریات مرد فراہم کرے یا فراہم کرنے کا انتظام کرے۔ قانون عام ہوتا ہے اس میں امیر وغریب کی قید نہیں ہوتی، البتہ جن پر یہ شرط لاگو نہو وہ از خود اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کو بشکرانہ نعمت سجدہ ریز ہو جانا چاہئے کہ خدا نے ان کو صاحبِ ثروت بنایا ہے۔ دوا دوی کی ان کو ضرورت نہیں ہے لیکن غیر مستطیع کیا کرے کیا وہ گھر میں بیٹھ کر پانی اور لکڑی کے لئے بیوی کو بازار کو بھیجے؟ شریعت کا حکم یہ ہے کہ بیوی کو پردہ میں رکھے اور یہ کام خود کرے۔ لیکن امراء کا لحاظ کر کے قانون کو ناقص نہیں بنایا جاسکتا۔ شریعت کی نظر میں امیر وغریب سب ایک ہیں۔ سب کے لئے شرعی احکام کی تعمیل ضروری ہے۔ اور سب پر اپنی حیثیت کے موافق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا واجب ہے۔ سرور کائنات مفخّر موجودات محمد رسول اللہ ﷺ بہ نفس نفیس بازار سے سودا لاتے اور ازواج

مطہرات کو پردہ میں رکھتے تھے۔ایک مرتبہ بازار سے کوئی چیز خریدی اور خود اُٹھالی۔ابو ہریرہؓ ساتھ تھے عرض کی مجھے دیدیجئے فرمایا۔''صاحب الشئی احق ان یحملہ یعنی اپنی چیز کو آپ اٹھانا چاہئے۔

مطلب یہ ہے کہ اپنا کام اور اپنے گھر کا کام کرنا عیب نہیں ہے۔امامنا حضرت مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سفر خراسان میں ہیں۔ایک مقام پر دائرہ ہوا۔اس روز بی بی ملکانؓ کی باری تھی حضرت ان کے حجرہ میں تشریف لے گئے' وہاں پانی نہ تھا' حضرت پانی کا گھڑا اُٹھا کر چشمۂ آب پر تشریف لے گئے۔پانی کا گھڑا اٹھا کر دائرہ میں واپس آئے تو بندگی ملک بخنؓ (جو ابھی حضرت کی خدمت میں تھے گجرات واپس نہیں ہوئے تھے) حضرت سے گھڑا مانگا' آپ نے نہیں دیا' مگر انہوں نے منت وسماجت کر کے گھڑا اپنے سر پر لے لیا' حضرت ان کے ساتھ چلتے رہے۔حجرہ کے دروازہ پر گھڑا ان کے سر پر لے کر اندر تشریف لے گئے اور بی بی سے فرمایا آج ہماری جو سویت ہے وہ دیدو۔ بی بی نے جواری کی ایک روٹی جس پر تھوڑی سی بھاجی رکھی ہوئی تھی دیدی۔حضرت نے لاکر ملک بخنؓ کو دی اور فرمایا کھاؤ اللہ نے دیا ہے۔ملک بخنؓ وہیں اُکڑوں بیٹھ کر کھانے لگے' فارغ ہوئے تو عرض کی میرانجی! میں خود پٹن کا ایک امیر تھا' اس کے علاوہ سلاطین گجرات کے درباروں میں رہا ہوں اور بارہا ان کے دسترخوان پر کھانے کا موقع ملا ہے لیکن اس روٹی اور بھاجی میں آج میں نے جو لذّت محسوس کی' کسی شاہی دسترخوان پر نصیب نہیں ہوئی۔جو لوگ'' آب وہیزم آوردن''(شوہر کو پانی اور لکڑی خود لانا چاہئے) کی شرط پر تبسم زیرلب سے طعن کرتے ہیں ان کو اس کی اصلی غرض پر بھی غور کرنا چاہئے جو اسی شرط میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ زن را در ستر دارد یعنی باہر کی اشیاء خود فراہم کرے اور بیوی کو پردہ میں رکھے۔اور یہی غرض اس شرط کی جان ہے۔جو اُسوۂ حسنۂ رسولؐ ومہدیؑ سے مستفاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سودا لانے کے لئے ازواج مطہرات کو بازار نہیں بھیجا اور مہدی علیہ السلام نے بی بی ملکانؓ کو پانی لانے کا حکم نہیں دیا۔بلکہ باعثِ تکوین عالم سید الانبیاء والمرسلین بازار کو خود تشریف لے گئے' سرخیل اصفیائے کرام جہاں' حضرت مہدیٔ امام آخرالزماں نے پانی کا گھڑا اُٹھالیا۔خاتمین علیہما السلام نے اپنے عمل سے واضح فرمادیا کہ بیوی کو کیا کام کرنا چاہئے اور شوہر کے ذمہ کون کون سے کام ہیں؟ سنت رسولؐ ومہدیؑ اور فقہی مسئلہ کو سامنے رکھ کر حضرت شاہ قاسمؒ نے بھی یہی فرمایا کہ حتی الامکان بیوی کو پردہ میں رکھو اور باہر کے کام خود انجام دو۔اور مثال کے طور پر اس زمانے کی ضرورت کا لحاظ کر کے لکڑی اور پانی کا ذکر فرمادیا۔ایسی صورت میں عابد روڈ اور پتھر گٹی کی شاندار دوکانوں سے

شاپنگ کا حوالہ کس طرح دیا جاسکتا تھا؟ اور پھر لکڑی اور پانی لانے کا یہ مطلب بھی تو نہیں ہے کہ یہ چیزیں اپنے ملازم کے ذریعہ نہ منگائی جائیں بلکہ پانی کا گھڑا اور لکڑیوں کا گٹھا اپنے سر پر اُٹھا کر لانا یا بیوی کے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھونا شرطِ نکاح ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مرد اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے یعنی باہر کے کام خود انجام دے۔ بیوی کے پردہ کا خیال رکھے اور اس کو بے پردگی پر مجبور نہ کرے۔ مرد گھر میں رہ کر عورتیں شاپنگ کرتی نہ پھریں۔

تاہم اگر آج اس تفصیل کی ضرورت نہیں ہے تو یہ شرط بایں الفاظ بہت کافی ہے۔

نان ونفقہ دیتا رہے، بیوی کو پردہ میں رکھے

کیونکہ مطلق نفقہ کو شرط گردانا جائے تو تب بھی وہ اپنے تمام جزئیات اور فروعات کو حاوی وشامل ہے۔ لیکن اس پر نکتہ چینی اور مضحکہ جائز نہیں۔ یہ شریعت رسول اللہ ﷺ کی توہین ہے۔ ایک ضروری بحث یہاں یہ رہ جاتی ہے کہ نفقہ دینے کو شرط گردانا کیا ضروری تھا؟ کیونکہ اگر یہ شرط نہ ہوتی تو تب بھی از روئے شرع شوہر پر نفقہ واجب تھا۔ اس کا ایک سطحی جواب تو یہ ہے کہ ہر کس وناکس فقہی مسائل سے واقف نہیں ہوتا اس لئے یہاں اس شرط کے ذکر کرنے سے یہ غرض ہوسکتی ہے کہ شوہر کو اس کی ذمہ داری سے آگاہ کیا جائے۔ اگر اس کو بطور شرط بیان کرنے کا صرف یہی مقصد لیا جائے تو اس میں تو کوئی اہمیت نہیں ہے اور نہ اس معنی سے اس کو شرط کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ عورت کو بذریعہ قاضی نفقہ لینے کا حق تو بغیر شرط کے بھی حاصل ہے۔ اس کو شرط قرار دینے سے فائدہ کیا حاصل ہوا؟ یہ تو تحصیل حاصل ہے مگر حضرت شاہ قاسمؒ نے اس کو بطور شرط قرار دیا ہے اس لئے ذرا بالغ نظری سے کام لیا جائے تو اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ نفقہ کی ادائی کو بطور شرط بیان کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ مسئلہ شرعی کے لحاظ سے زنِ ناشزہ کو (یعنی نافرمان عورت کو جو گھر سے باہر ہے) نفقہ نہیں ملتا اور شوہر اس کو نافرمان ثابت کردے تو قاضی بھی نفقہ نہیں دلاسکتا۔ اسی طرح زوجہ صغیرہ ہے ناقابل وطی ہے۔ شوہر اس سے تمتع حاصل نہیں کرسکتا ہے تو اس صورت میں بھی شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہے۔ ادائی نفقہ کو شرط قرار دینے میں فائدہ یہ ہے کہ ولو بالفرض عورت ناشزہ ہے یا صغیرہ، ناقابل وطی وتمتع ہے تو تب بھی وہ نفقہ پاسکتی ہے۔ کیونکہ نافرمانی یا صغیرہ اور ناقابل استمتاع ہونے سے نکاح باطل نہیں ہوتا پس جب تک نکاح باقی ہے وہ اس شرط کی رو سے باوجود ناشزہ یا صغیرہ ہونے کے نفقہ پانے کی مستحق ہے۔ عدالت تک نوبت پہنچے تو ''بنابر شرط'' قاضی نفقہ کی ڈگری دے سکتا ہے۔

حضرت شاہ قاسمؒ جیسے وسیع النظر عالم دین کے ذہن عالی میں ادائی نفقہ کو شرط قرار دینے میں یہی فائدہ مضمر ہے کہ عورت' نافرمان یا صغیرہ ہے یا ایسی صورتوں میں کہ جن کی وجہ سے نفقہ نہیں پاسکتی تو تب بھی تابقائے نکاح نفقہ پانے کی مستحق رہے گی۔ پس حضرت نے ادائی نفقہ کو شرط قرار دے کر فقہ کے اسی دقیق مسئلہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ جو عورت کے حق میں سراسر مفید ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

شرط سوم: عندالطلب مہر ادا کرے

حسب احکامِ شرع شریف مہر کی دو قسمیں ہیں ایک موجل دوسری معجّل۔

مہر موجل کی مدت' شوہر کی موت یا طلاق تک ہے موت یا طلاق کے بغیر شوہر کو ادائی مہر پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر بھی قرض ہے اور قرض قبل مدت ادا کرنا اولیٰ وانسب ہے۔ لیکن شوہر ادا نہ کرے تو اس کی موت یا طلاق کے بغیر عورت کو قاضی کے پاس دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے۔

مہر معجّل کے معنی یہ ہیں کہ مہر معاً ادا کردے یا عندالطلب ادا کرے اگر ادا نہ کرے تو عورت کو دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ادائی مہر تک عورت' مرد کے ساتھ سفر کرنے پر انکار کرسکتی اور اپنے ذات کو روک لینے کا بھی اختیار ہے۔ لہذا ہمارے پاس اس شرط کے ذریعہ مہر کو معجّل قرار دیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ یہی ہے کہ مرد کی موت یا اس کے طلاق دینے کے بغیر عورت اگر چاہے تو دعویٰ کرکے اپنا مہر لے سکتی اور قاضی عندالثبوت ڈگری دے سکتا ہے۔

مہر بھی ایک قرض ہے جس طرح قرض معاف کرایا جاسکتا ہے اسی طرح مہر بھی معاف ہوسکتی ہے اس لئے شرط کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ اگر مہر عندالطلب ادا نہ کرسکے تو ادا کرنے کا وعدہ کرے یا معاف کرالے۔

ایک غلط فہمی کو رفع کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر مرد مہر قبول کرلے لیکن ادا کرنے کی نیت نہ رکھے تو نکاح نہیں ہوتا بالفاظ دیگر وہ حرام کا مرتکب ہوتا رہے گا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے مہر کم ہو یا زیادہ قبولیت کافی ہے نیت کا اعتبار نہیں تعین اور قبولیت کے بغیر بھی نکاح ہوجاتا ہے اور مہر مثل لازم آتی ہے۔

اگر مہر ادا نہ کرے یا معاف نہ کرائے اور ادا کرنے کی نیت بھی نہ ہو تو دنیا میں نکاح متاثر ہوتا ہے نہ ارتکاب حرام کا اندیشہ ہے البتہ عدم ادائی کی نیت آخرت میں موجبِ خسران ہے۔ عدم ادائی اور عدم ادائی کی نیت دونوں باتیں بدووجہ نامناسب ہیں۔

(۱) جس طرح قیامت میں حقوق العباد کا تصفیہ ہوگا کہ ظالم کی نیکیاں مظلوم کے اور مظلوم کے گناہ ظالم کے ذمہ رہیں گے۔ اسی طرح عورت کی شکایت پر کہ اس نے میرا قرض (مہر) ادا نہیں کیا

حکم ہوگا کہ عورت کے گناہ مرد کے اور مرد کی نیکیاں عورت کے حوالہ کی جائیں۔

(۲) بعض روایات میں آیا ہے کہ جس طرح قرض ادا نہ کرنے کی نیت رکھنے والے کا حشر چوروں میں ہوگا اسی طرح اگر کوئی مرد مہر قبول کرلے خواہ کم ہو یا زیادہ لیکن ادا نہ کرے اور ادا کرنے کی نیت بھی نہ رکھے تو قیامت کے روز اس کا شمار زانیوں میں ہوگا۔غرض یہ ہے کہ مہر ادا نہ کرنے کی نیت بھی رکھے تو نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔دوسرے قرضہ کی طرح مہر کی ادائی کو بھی ضروری سمجھے اور ادا کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

<u>شرط چہارم</u> : اس کے دو جزو ہیں۔ پہلا جزو یہ ہے کہ دائرہ دین سے باہر نہ لیجائے۔دوسرا جزو یہ ہے کہ والدین کے گھر جانے سے منع نہ کرے۔ والدین کے گھر جانے سے منع نہ کرنے کی شرط بالکل مسئلہ شرعی سے مستفاد ہے۔ درالمختار اور فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے۔'' **لا یمنعها من الخروج الی الوالدین فی کل جمعة وعلیه الفتوی**''یعنی''فقہاء کا فتویٰ یہ ہے کہ شوہر بیوی کو ہر جمعہ کو(ہفتہ میں ایک دن) والدین کے گھر جانے سے منع نہ کرے''

یہ شرط نہ بھی ہوتی تو شوہر پر لازم ہے کہ والدین کے گھر جانے سے مانع ومزاحم نہ ہو۔لیکن شوہر والدین کے گھر جانے سے منع کردے تو عورت کو رک جانا ضروری ہے۔اس مسئلہ کو بطور شرط بیان کرنے سے فائدہ یہ ہے کہ اگر عورت بلا اجازت ماں باپ کے گھر چلی جائے تو اس شرط کی بناء پر ناشزہ (نافرمان) نہ ہوگی کیونکہ وہ حسب شرط اپنا حق استعمال کررہی ہے۔اوران ایام کا نفقہ شوہر کے ذمہ سے ساقط نہ ہوگا۔

دائرہ دین سے باہر نہ لے جانے کی شرط بھی ایک فقہی مسئلہ پر مبنی ہے۔شرعی مسئلہ یہ ہے کہ بیوی کو نیک بخت اور صالحین کے محلّہ میں رکھنا چاہئے۔صاحب درالمختار لکھتے ہیں۔''**یامر باسکانها بین جیران صالحین بحیث لا تستوحش**''یعنی''محکمہ قضاۃ سے مرد کو حکم دیا جائے گا کہ زوجہ کو نیک بخت لوگوں کے پڑوس میں رکھے جہاں اس کو وحشت نہ ہو۔''

علامہ شامیؒ ردالمختار میں لکھتے ہیں۔'' **للزوج ان یسکنها حیث احب ولکن بین جیران صالحین**''یعنی''شوہر اپنی بیوی کو جہاں چاہے رکھ سکتا ہے لیکن نیک اور صالح لوگوں کے ہمسایہ میں رکھنا ضروری ہے۔''

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے۔''**فالقاضی یامر الزوج ان یسکنها فی قوم صالحین**''یعنی''قاضی شوہر کو حکم دے گا کہ بیوی کو صالحین میں رکھے۔

پس دائرہ دین کی اقامت بھی اس اصل کی ایک فرع ہے۔''دائرہ'' مہدویہ کی ایک خصوصی اصطلاح ہے۔دائرہ کی ہیئت کذائی اگرچہ آج مفقود ہے لیکن ایک محدود دائرہ کی اقامت سے مقصد یہ

ہے کہ عورت کو اپنے فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں سہولت ہو۔ ہماری قومی عورتوں میں مذہبی جذبہ عموماً مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ عورت اپنے ہم مذہب مہدویوں کی آبادی میں جہاں وہ اپنے استاذ' پیر طریقت' اپنے بزرگوں اور عزیزوں سے دین و مذہب کے بارے میں استفادہ کرسکتی ہے وہی مقام اس کے حق میں دائرہ دین کا حکم رکھتا ہے۔ اگر عورت اپنی موت وحیات کا خیال کر کے ایسے مقام کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہو تو اس شرط کی بناء پر اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت شاہ قاسمؒ نے بڑی دِقت نظر سے اس کو منجملۂ شرائط نکاح سے قرار دیا ہے۔ جس طرح دائرہ دین میں اقامت کی شرط زمانہ سلف میں ضروری تھی اسی طرح آج اس دورِ انحطاط میں بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس شرط کا مفہوم اور حاصل مطلب یہ ہے کہ فرائض شرعیہ اور امور دینیہ کی ادائی میں عورت کی مزاحمت نہ کی جائے۔ دائرہ کی اقامت وقت کی ایک اہم ضرورت تھی جس کا حضرت نے خصوصیت سے ذکر فرمایا ورنہ مقصود بالذات دائرہ کی اقامت نہیں ہے بلکہ عورت کے دینی و مذہبی معاملات میں مرد کے عدم مداخلت کو بطورِ شرط کے پیش کرنا اور اس قبولیت کا اقرار لینا اس شرط کی اصلی غرض ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچیکہ شریعت اسلامیہ میں شوہر پر مہر کی ادائی لازم ہے' نان ونفقہ بھی اس پر واجب ہے اور مسئلہ کی رو سے بیوی کو صالحین وصادقین کے محلّہ میں رکھنا اور مانباپ کے گھر جانے سے منع نہ کرنا ضروری ہے۔ اس کے باوجود ان باتوں کو بطور شرط پیش کرنے اور پھر اس کو شرائط شرعیہ کہنے کی کیا وجہ ہے۔؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ مہر شوہر پر ضرور واجب الادا ہے۔ لیکن اس شرط سے مہر کو معجّل نہ قرار دیا جائے تو عورت کو دعویٰ کر کے مہر لینے کا حق نہیں ہے۔ اس شرط کی وجہ سے شوہر کی موت یا اس کے طلاق دینے کے بغیر وہ دعویٰ کر کے مہر لے سکتی ہے۔ اسی طرح بعض وقت بیوی کا نان ونفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوتا۔ نان ونفقہ کو بطور شرط پیش کرنے سے مقصد یہ ہے کہ جن صورتوں میں شوہر ادائی نفقہ سے بری ہے ان صورتوں میں بھی عورت دعویٰ کر کے تا بقائے نکاح اپنا نفقہ پاسکتی ہے۔ مسئلہ شرعی یہی ہے کہ مانباپ کے گھر جانے کی اجازت دینا چاہئے۔ لیکن شوہر منع کرے تو اس کو رک جانا بھی ضروری ہے ورنہ ناشزہ (نافرمان) ہوگی اور نفقہ ساقط ہوگا۔ اس کو شرط گردانتے سے ناشزہ نہ ہوگی اور نفقہ کی مستحق ہوگی۔ اسی طرح دائرہ دین کی اقامت کو بطور شرط بیان کرنے سے فائدہ یہ ہے کہ اگر نیک بخت لوگوں کے محلے سے شوہر جدا رکھے یا بالفاظ دیگر مذہبی معاملے میں مداخلت کرے تو حق بجانب زوجہ ہوگا۔ اور قاضی شریعت کا فیصلہ زوجہ کے حق میں رہے گا۔ اس کے باوجود بھی **الرجال قوامون علی**

النساء کا مظاہرہ کر کے مانباپ کے گھر سے منع کرے اور دینی و مذہبی امور میں مداخلت کرے تو عورت مجبور ہے اور عنداللہ ماجور ہے اور مرد عدم ایفائے عہد کا ذمہ دار ہے اور عنداللہ ماخوذ ہے۔

ان شرائط کو شرائط شرعیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ شرط کی دو قسمیں ہیں۔ شرط صحیح، شرط فاسد۔ جو شرط لوازمات نکاح یا مقتضیات نکاح کے خلاف ہے وہ شرط فاسد ہے۔ مثلاً مہر، نفقہ، جنسی تعلقات، لازم نکاح ہیں۔ ان کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ یعنی اس شرط پر نکاح ہو جائے کہ مہر نہیں ہوگی یا عورت نفقہ طلب نہیں کرے گی۔ یا شوہر وطی نہیں کرے گا۔ تو چونکہ یہ لوازمات نکاح ہیں اس لئے یہ شروط فاسدہ ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ نکاح صحیح ہے اور شرط باطل ہے۔ یعنی شرط کے باوجود بھی زوجہ مہر اور نفقہ طلب کر سکتی اور مرد پر ان کی ادائی لازم ہے اور مرد جنسی تعلقات قائم رکھ سکتا ہے۔ فقہا نے شرعی ضابطہ یہ لکھا ہے۔

''لا یبطل النکاح بالشرط الفاسد وانما یبطل الشرط دونہ''

یعنی ''شرط فاسد سے نکاح باطل نہیں ہوتا بلکہ شرط باطل ہو جاتی ہے''

مطلب یہ ہے کہ ایسے شرائط جو لوازمات نکاح کے خلاف ہیں وہ باطل، غیر شرعی اور نا قابلِ نفاذ ہیں۔ او جو شرائط لوازماتِ نکاح کے منافی نہیں ہیں اور عاقدین ان پر متفق ہو جائیں تو وہ شرائط صحیح، شرعی اور قابل نفاذ ہیں۔ پس ہمارے پاس جو شرائط رائج ہیں ان میں سے ایک شرط ''اختیار او بدست او باشد'' تو ایسی شرط ہے کہ شریعت نے خود اس کی اجازت دی ہے۔ مہر و نفقہ کی ادائی کی شرط سے جو لوازمات نکاح سے ہیں ان کی مزید تاکید و توثیق کی جاتی ہے۔ بیوی کو صالحین کی صحبت میں رکھنا اور مانباپ کے گھر سے منع نہ کرنا خود مسئلہ شرعی ہے۔ لیکن شرط کے ذریعہ مرد کو پابند کر دیا جاتا ہے کہ وہ بطور خاص اس کا خیال رکھے۔ غرض جس شرط سے لوازمات نکاح کی نفی نہ ہوتی ہو، عاقدین منظور کر لیں تو وہ شرط، شرط شرعی بن جاتی ہے۔ انہی معنی کے اعتبار سے حضرت شاہ قاسمؒ نے اپنے خطبہ میں ان شرائط پر شرائطِ شرعیہ کا اطلاق فرمایا ہے۔

حضرت شاہ قاسم مجتہد گروہؒ کے خطبہ میں ایجاب کے ساتھ ہی مرد سے ان شرائط کی قبولیت کا بالاجمال اقرار کرالیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں کہ مرد سے اس طرح خطاب کیا جائے کہ

'' فلاں بنت فلاں را بہ بدل مہر ( )وبچہار شرط شرعی بزنی خواستی وقبول کردی؟ جس کو مرد قبول کر لیتا ہے اس اقرار بالاجمال کے بعد ختم خطبہ پر ان شرائط کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ ایجاب وقبول کے بعد ان شرائط کو بیان کرنے میں کوئی

فائدہ نہیں ہے کیونکہ ختم نکاح کے بعد یہ شرائط کالعدم ہیں۔اب ان کی صورت صرف ''وعدہ'' کی ہے۔ خواہ مرد اپنا وعدہ پورا کرے یا نہ کرے اس کو اختیار ہے۔شرائطِ نکاح کا ان پر اطلاق نہ ہوگا۔لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔کیونکہ حضرت شاہ قاسمؒ کا طریقہ عمل ایک ضابطہ شرعیہ پر مبنی ہے۔وہ یہ کہ اقرار بالاجمال' اقرار بالتفصیل کو مستلزم ہے۔مثلاً ایمان مجمل کا اقرار کرنے والا ایمان مفصل کا مقر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے'' **لا اله الا الله محمد رسول الله**'' کی شہادت دینا گویا توحید' متعلقاتِ توحید' ذات مع الصفات' رسالت اور جملہ احکام رسالت اور جمیع ماجاء بہ الرسول پر ایمان لانا ہے۔''مہدی موعود آمد ورفت'' کا اقرار مکمل تصدیق ہے۔ذاتِ مہدی' متعلقاتِ مہدیت اور جملہ احکام وفرامین مہدی علیہ السلام پر ایمان وانقیاد' اس تصدیق مجمل میں مضمر ہے۔اسی طرح چہار شرائط نکاح کی قبولیت کا اجمالاً اقرار اس تفصیل کو قبول کرنے کا مستلزم ہے جو سینکڑوں سال سے بین القوم مشہور ہیں۔اور'' چہار شرط'' کے ساتھ ہی سامع کا ذہن اس کی تفصیل کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔تاہم مزید یاددہانی کے طور پر خطبہ کے بعد ان شرائط کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ان کی قبولیت کا اقرار نہیں کروایا جاتا۔

ان شرائط کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ ہمارے یہاں کے خطبات نکاح میں جن کو ہمارے بزرگوں نے مرتب فرمایا ہے۔یہ شرائط ایجاب وقبول کا جزو بنادی گئی ہیں۔چنانچہ آج سے چارسو سال پہلے حضرت عالم باللہؒ نے شریعت حقہ کی روشنی میں عورت کو'' امر بالید'' یعنی از خود مطلقہ ہوجانے کا اختیار دلا کر طبقۂ نسواں پر ایک احسانِ عظیم فرمایا ہے۔اور حضرت شاہ قاسم مجتہد گروہؒ نے اپنی بے نظیر فقاہت اور عدیم المثال نکتہ رسی سے نہایت جامع ومانع ایسی مزید تین شرطیں مقرر فرمائی ہیں جو عورت کے دینی ودنیوی فوائد پر حاوی ہیں۔اور جن میں عورت کی گوناگوں مشکلات کا حل موجود ہے۔**جزا هما الله عنا وعن جميع المصدقين خير الجزا**

یہ چاروں شرطیں ہمارے بزرگوں کا ایک بہترین کارنامہ' ان کے تفقہ فی الدین کا ایک اعلیٰ نمونہ اور ان کی قیادت ورہنمائی کا ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔جن کو ہم نہایت بُری طرح پامال کررہے ہیں۔آج ان شرائط کو کم نگاہی سے دیکھا جاتا اور بعض پر مضحکہ ہوتا ہے۔یا تو ان شرائط کو سرے سے بیان ہی نہیں کیا جاتا یا بیان کیا جاتا ہے تو عدم واقفیت کی وجہ سے وقت ضرورت بھی ان سے استفادہ نہیں کیا جاتا۔سننے والے الگ چیں بجبیں ہوتے ہیں۔اور اغیار کی موجودگی الگ گلوگیر ہوجاتی ہے۔اتنی ہمت نہیں کہ اعتراض کرنے والے کو کہا جائے کہ

سخن شناس نه دلبر اخطا اینجاست

گویا معترض کو جاہل بنانے کے بجائے ہم اپنی جہالت کا ثبوت دیتے اور اپنے بزرگوں کی عقل وفہم اور ان کے علم وفضل پر حرف لاتے ہیں۔ حالانکہ تمام شرائط کی عموماً اور شرطِ اول کی خصوصاً اہمیت اور افادیت ایسی لاجواب ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ امر ضرور قابلِ غور ہے کہ ہم نے اپنی ذمہ داری کو کہاں تک پورا کیا؟ ایک بے زبان اور بے بس و بے کس عورت کے شرعی موقف کو کس قدر ااستوار کیا۔ اور ہم سے عقیدت وارادت کا اس کو کیا صلہ ملا؟

اگر شرائط کی ضرورت اور افادیت پیش نظر نہ ہو اور شریعتِ اسلامیہ نے عورت کو جو حقوق واختیارات عطا فرمائے ہیں اگر ہم نے اس کی حفاظت نہ کی اور صرف ایجاب وقبول کرادیا تو کچھ نہ کیا۔ یہ کام تو سرکاری قاضی بھی بطریقِ احسن انجام دیتا ہے۔ سیاہیہ بھی مرتبہ ہوتا اور وقت ضرورت کام آتا۔ لیکن اس صورت میں قوم مہدویہ کی خصوصیات نکاح کہاں باقی رہتیں۔ سرکاری سیاہہ کو قبول نہ کرنے کے بارے میں دوسرے مصالح کے علاوہ یہ نکتہ بھی فقیر کے پیش نظر تھا۔ اگر ہم بھی صرف ایجاب وقبول پر اکتفا کرلیں اور عورت کے شرعی حقوق کی حفاظت نہ کریں تو ہم میں اور قاضی میں کیا فرق رہا قوم کے علماء، مرشدین اور عمائدین کے لئے یہ ایک ضروری لمحۂ فکر

☆☆☆☆☆

بولا چالا معاف کرنا اور احکام شرع

حسبِ احکامِ شرع شریف ہر مسلمان پر جو ذمہ داریاں اور جن کی ادائی اس پر واجب ہے اُن کی دو قسمیں ہیں۔ایک حقوق اللہ، دوسری حقوق العباد۔مثلاً نماز، روزہ، حج، زکواۃ وغیرہ فرائض اور اُن کے سوا تمام واجبات وسنن خالص اللہ کے حق ہیں۔جن کا ادا کرنا بندہ پر واجب ہے اور ان کا ترک کرنا گناہ ہے۔اگر بندہ اِن امور میں قاصر العمل ہو تو خدائے تعالیٰ اپنے حق کو معاف کرنے میں مختار ہے۔وہ چاہے تو اپنے فضل وکرم سے بندہ کے گناہوں کو جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں، معاف فرمادے۔

دوسرے وہ امور ہیں جو ایک مسلمان کی طرف سے دوسرے مسلمان پر واجب ہیں۔اور جن کی پابجائی اس پر منجانب شارع علیہ السلام لازم و مُتَحَتّمْ ہے۔وہ حقوق العباد کہلاتے ہیں۔ان کے بارے میں ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ

المسلم اخوالمسلم لا یظلمه ولا یخذ له ولا یکذبه ولا یحقره التقویٰ ههنا و یشیر الیٰ صدره ثلاث مرات بحسب امری من الشران یحقره اخاه المسلم ، کل المسلم علی المسلم حرام دمه و ماله و عرضه (رواۂ مسلم)

یعنے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے نہ اس کو اپنی امداد و اعانت سے مایوس کرے نہ اس کی تکذیب کرے نہ اس کی تحقیر وتوہین کرے۔تین مرتبہ اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تقویٰ یعنی پرہیزگاری اور خدا کا ڈر یہاں ہے (دل صلاحیت یافتہ ہو تو تمام جسم صلاحیت یافتہ ہوجاتا ہے۔اور اگر دل میں کوئی خرابی ہو تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے) پھر فرمایا کہ کوئی شخص اتنی سی بات پر بھی شریر یا شر پسند کہلایا جاسکتا ہے کہ اگر اس نے اپنے ایک مسلمان بھائی کی توہین کی ہو فرمایا ایک مسلمان کا خون، اس کا مال، اس کی عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔

اس فرمان واجب الاذعان کا خلاصہ یہہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کسی جہت سے بھی ظلم نہ کرے۔خواہ ظلم اس کے نفس پر کیا جائے یا اس کے مال میں چوری یا خیانت کرکے اس پر ظلم کے مرتکب ہوں یا اس کی عزت وآبرو پر حملہ کرکے اسکی دل آزاری اور دل شکنی کی جائے غرض ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر مطلقاً ظلم حرام ہے اور ظلم کی مذمت میں ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا

ہے کہ " **الظلم ظلمات یوم القیامۃ**" یعنی ظلم قیامت کے روز ظالم کے لئے تاریکیوں کا باعث ہے"
بعض بزرگوں کا قول ہے کہ:۔ **لا تظلم الضعفاء فتکون من اشرار الاشقیاء** یعنی کمزوروں پر ظلم نہ کرو ورنہ قیامت کے روز بدترین اشقیاء میں تمہارا حشر ہوگا۔

یہی شرعی ضابطہ ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنے حقوق کو معاف فرمادیتا ہے لیکن حقوق العباد کو اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک کہ دنیا میں وہ لوگ خود معاف نہ کریں۔ جن پر ظلم ہوا ہے یا جنکی حق تلفی ہوئی ہے۔ اس مفہوم کو ایک حدیث میں ایک واضح مثال دے کر سمجھایا گیا ہے اور اس حدیث شریف پر تمام حقوق العباد کو قیاس کیا جاسکتا ہے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ " **ایاکم والغیبۃ فانھا اشد من الزنا قالو ا یا رسول اللہ کیف الغیبۃ اشد من الزنا قال ان الرجل قد یزنی ثم یتوب فیتوب اللہ علیہ وان صاحب الغیبۃ لا یغفرلہ حتی یغفرلہ صاحبھا** (شرح اربعین نووی)

یعنی تم غیبت سے دور رہو کیونکہ یہہ زنا سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ غیبت زنا سے بڑا گناہ کس طرح ہوئی ؟ فرمایا اس کی وجہ یہہ ہے کہ آدمی کبھی زنا کا مرتکب ہوتا اور پھر توبہ کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے لیکن غیبت کو معاف نہیں کرتا جب تک کہ جس کی غیبت کی گئی ہے وہ معاف نہ کرے۔

کتاب مذکور میں ایک روایت یہہ بھی ہے کہ

یوتی العبد کتابہ یوم القیامۃ فلا یریٰ فیہ حسنۃ فیقول یا رب این صلاتی وصیامی وطاعتی فیقال لہ ذھب عملک کلہ با غتیا بک للناس ویعطی الرجل کتابہ بیمینہ یری فیہ حسنات لم یعملھا فیقال لہ ھٰذا بما اغتیابک بہ الناس وانت لا تشعر

یعنی ایک آدمی کو قیامت کے روز اس کا نامۂ اعمال دیا جائے گا اور وہ اس میں ایک نیکی بھی نہ دیکھے گا عرض کرے گا پروردگار! میری نماز میرے روزے اور میری وہ سب طاعتیں کہاں ہیں؟ حکم ہوگا تیری سب نیکیاں تو اس شخص کو دیدی گئیں جس کی تو نے دنیا میں غیبت کی تھی۔ ایک دوسرے شخص کو اس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اس میں ایسی نیکیاں دیکھے گا جو اس نے دنیا میں نہیں کی تھیں۔ اس سے کہا جائے گا یہ نیکیاں ان لوگوں کی تجھے دی گئی ہیں۔ جنہوں نے دنیا میں تیری غیبت کی تھی اور تجھے اس کا علم نہ تھا

غیبت کے سواء تمام مظالم کی بھی یہی کیفیت ہے کہ جب تک مظلوم اس کو معاف نہ کردے ظالم کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتے۔ اور چونکہ قیامت کا دن ''یوم الجزاء'' ہے ''یوم العمل'' نہیں ہے۔ اس لئے وہاں برائی کے بدلے میں برائی کرنے کا موقع ہے اور نہ وہاں ایک دوسرے کے ظلم کو معاف ہی کر سکے گا بلکہ یہ صرف مکافات کا دن ہے۔ اسلئے ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی۔ اور مظلوم کے گناہ ظالم کے حوالے کئے جائیں گے۔

دنیا میں حقوق العباد کی رعایت نہ کرنے اور ناحق وناروا کسی پر ظلم وزیادتی کرنے یا کسی کا واجبی حق غصب کر لینے اور اپنی شرعی ذمہ داری سے سبکدوش نہ ہونے کا مواخذہ نہ صرف آخرت میں ''نقصانِ مایہ'' یعنی اپنی نیکیوں کو برباد کر لینے کا موجب ہے بلکہ آخرت میں ''شماتت ہمسایہ'' یعنی سر محشر ذلت ورسوائی کا بھی باعث ہے چنانچہ کسی کا مال سرقہ کرلیا جائے یا اس میں خیانت کی جائے تو قیامت کے روز اس بھری محفل میں جو فضیحت ورسوائی ہوگی ایک حدیث شریف میں اس کا منظر دکھایا گیا ہے (شرح جامع صغیر للمناوی)

وفی حدیث اتق اللہ لا ناتی یوم القیامۃ ببعیر تحملہ علی رقبتک لہ مرغاء او بقرۃ لھا خوار اورشاۃ لھا ثواج یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو اللہ سے ڈرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی کا اونٹ چوری کرو اور قیامت کے روز تم اس کی گردن پر اٹھا کر لاؤ اور وہ بلبلاتا رہے یا گائے ہو اور وہ ''بائیں بائیں'' کرتی رہے یا بکری ہو اور وہ ''میں میں'' کر رہی ہو۔

صرف غیبت اور ان چند جانوروں کی چوری پر موقوف نہیں ہے اس کو شارع علیہ السلام نے مثال ونمونہ کے طور پر ذکر فرمایا ہے بلکہ کسی مسلمان بھائی کی کسی قسم کی بھی حق تلفی کی گئی ہو۔ اس کو جسمانی وروحانی تکلیف پہنچائی گئی ہو۔ یا اس کا مال چوری کیا گیا ہو تو مرنے سے پہلے اسی دنیا میں اپنے مظالم کو اس سے معاف کروانا، نہایت ضروری ہے ورنہ اس کے معاوضہ میں قیامت کے روز اپنی نیکیوں سے دست کش ہونا پڑے گا اور میدان حشر میں ذلت وخواری مزید براں رہے گی۔

حضرت امام مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک موقع پر اسی مسئلہ شرعی کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ حقوق العباد کو بندوں ہی سے معاف کرانا چاہئے۔

چنانچہ روایت ہے کہ حضرت بندگی میاں شاہِ نعمت رضی اللہ عنہ جب پہلی مرتبہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے حالات عرض کئے تو ارشاد فرمایا کہ: ''**گناہ خدائے تعالیٰ خود عفو خواھد کرد کہ غفور رحیم است اما گناہ خلق از خلق عفو باید کنانید**'' (شواہد الولایت) خلاصۂ

فرمان یہہ ہے کہ ''تم جو گناہ خدائے تعالیٰ کے کئے ہیں ان سے توبہ کرو وہ غفور رحیم ہے۔خود معاف کردے گا لیکن گناہ خلق کو خلق ہی معاف کرسکتی ہے۔تم سے جن جن لوگوں کے گناہ سرزد ہوئے ہیں جاؤ اور ان سے معاف کراؤ''۔

اس فرمانِ صداقت نشان سے بھی یہی ثابت ہورہا ہے کہ حقوق العباد کو بندوں سے معاف کرانا اشد ضروری ہے۔اس فرمان کی تعمیل میں مہدویہ اس مسئلہ شرعی پر زیادہ پابندی کے ساتھ عمل کرتے ہیں اس لئے کہ تزکیۂ نفس،تقویٰ اور طلبِ دیدار الٰہی کی اور اس کے لوازم کی اعلیٰ تعلیم سے حضرت مہدیٔ موعود علیہ السلام نے مشرف فرمایا ہے۔

اس مسئلہ کی مزید توضیح یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ نے جس کام کا حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے اس پر ہر مسلمان کو شارع علیہ السلام کی تصریح کے مطابق دل سے ایمان لانا،زبان سے اقرار کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔خواہ شارع کا حکم حقوق اللہ سے متعلق ہو یا حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہو۔ دونوں صورتوں میں ایمان قلبی اور اقرار لسانی کے بعد شارعؑ کے منشا کے مطابق اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔اگر کسی کا عمل شارعؑ کے حکم یا منشاء کے خلاف ہو تو یہ قصور عمل ہے،اس کی تلافی حقوق اللہ میں توبہ سے اور حقوق العباد میں بندہ کے معاف کرنے سے ہوسکتی ہے۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''غیبت کو خدائے تعالیٰ معاف نہیں کرتا جب تک کہ جس کی غیبت کی گئی ہے وہ شخص معاف نہ کردے''

پس خدا اور رسولؐ نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ جس حُسنِ سلوک کا حکم دیا ہے اور جس ظلم وزیادتی سے منع کیا ہے،اگر کوئی مسلمان اس پر عمل میں قاصر رہے۔تو اس کی تلافی،معافی سے ہوسکتی ہے اس کو اصطلاحِ مہدویہ میں ''کہا سنا'' یا ''بولا چالا'' معاف کرانا کہتے ہیں۔

یہہ الفاظ بہت جامع اور قصورِ عمل کے پورے فحویٰ و مطالب کو حاوی ہیں۔ان کا معنی یہہ ہے کہ ''ایک شخص دوسرے سے اپنے قصورِ عمل کا اعتراف کرتا اور درخواست کرتا ہے کہ اگر مجھ سے آپ کی کوئی حق تلفی ہوئی ہے یعنی اگر میں نے کسی وقت آپ کی برائی کی ہے،غیبت کی ہے،چغلی کھائی ہے یا میری طرف سے آپ کو کسی قسم کی جسمانی یا روحانی تکلیف پہنچی ہے یا آپ کا مال آپ کی اجازت کے بغیر میرے تصرف میں آ گیا ہے تو لِلّٰہ معاف کیجئے۔

اگر چہ کہ اس عملِ خیر کیلئے کسی دن یا تاریخ کی تخصیص نہیں ہے اور توبہ کی طرح اس معافی کا وقت بھی آخر عمر تک ہے تاہم جس وقت بھی اپنے قصورِ عمل کا احساس ہو تو فوراً اس کی تلافی ضروری ہے۔

یہاں یہہ امر واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے بعض مہینوں کو اور مہینوں میں بعض ایام کو فضیلت و بزرگی عطا فرمائی ہے اور امت محمدیہ کے لئے تکفیر ذنوب اور تطہیر قلوب کا ان ایام ولیالی کو ذریعہ بنایا ہے۔ انہی ایام متبرکہ کے منجملہ یوم عاشورہ بھی ہے کہ یہہ بڑی فضیلت و کرامت کا دن ہے چنانچہ خدائے تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی دن پیدا کیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ اسی دن قبول فرمائی ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی دن آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔ کشتیٔ نوح علیہ السلام ختم طوفان کے بعد ''جودی'' پہاڑ پر اس دن ٹھیری۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نارِ نمرود سے حضرت یونس علیہ السلام بطن ''حوت'' سے حضرت ایوب علیہ السلام اسقام و آلام سے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام فتنۂ فرعون سے اسی دن نجات پائے۔

زمین و آسمان، جبال و بحار، لوح و قلم، عرش و کرسی اور تمام ملائکہ کی پیدائش اسی دن ہوئی اور نزول باراں (بارش) سب سے پہلے یوم عاشورہ کو ہوا ہے۔ غالباً انہیں فضائل کی بناء پر خدائے تعالیٰ نے امام انام مولائے اسلام، سید الشہدائے کربلا حضرت سیدنا الحسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے لئے اسی دن یعنے یوم عاشورہ کو منتخب فرمایا اور احادیثِ شریفہ سے ثابت ہے کہ قیامت بھی دسویں محرم کو واقع ہوگی (انشاءاللہ تعالیٰ)

حضرت رسول اللہ ﷺ کی پاک سیرت میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مرض الموت میں یہ ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کا قرض میرے ذمہ ہو یا میں نے کسی کی جان و مال یا عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا ہو تو وہ اسی دنیا میں مجھ سے انتقام لے لے۔ اس فرمان پر مجمع پر ایک سناٹا تھا۔ تاہم ایک شخص اٹھا اور اپنے ایک معمولی قرضہ کا دعویٰ کیا اور حضرت نے اس کی ادائی کا حکم دیا۔

بعض روایات سے پایا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، نے شہادت سے پہلے اپنے اہل قافلہ سے معافی کا عمل فرمایا تھا۔ غالباً حضرت ہی کی اتباع میں یہ طریقہ مہدویہ میں جاری ہے اور اس دن کے فضائل و مناقب کی بناء پر اس عمل کو اس مبارک دن سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

غرض اسی دنیا میں حقوق العباد کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کی جاتی ہے۔ پس یہ عمل نہایت ضروری اور خدا اور رسولؐ کے احکام کے عین مطابق ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب**

☆☆☆☆☆

فضائل یوم عاشورہ

ماہنامہ نور حیات بابتہ ماہ اپریل ۱۹۶۷ء میں دسویں محرم کو بولا چالا معاف کرانے کے تعلق سے جو فتویٰ شائع ہوا ہے وہ مجلس علمائے مہدویہ ہند کا شاہکار ہے۔ مستفتی کا سوال یہ تھا کہ ۱۰ر محرم کو بولا چالا معاف کرانے کا جو طریقہ مہدویہ میں رائج ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔

اس سوال کے دو جزو ہیں۔

(۱) بولا چالا معاف کرانے کی وجہ یا ضرورت کیا ہے؟

(۲) یہ عمل دسویں محرم سے مخصوص کیوں ہے؟

پہلا جزو نہایت اہم و وضاحت طلب اور شرعی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور مقصود بالذات یہی جزو ہے۔ اس کے جواب میں جو دقیقہ سنجی کی گئی ہے جن گوشوں کو کھولا گیا ہے اس عمل کی افادیت پر احکامِ خدا اور رسولؐ کے تحت جو روشنی ڈالی گئی ہے اور اگر ہمارے اس طریقہ جاریہ پر عمل نہ کیا جائے تو اس کے نقصانات کو جن جن پہلوؤں سے واضح کیا گیا ہے اس کی بحث نور حیات کے پورے چار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جس کے پڑھنے کے بعد اس کی ضرورت و اہمیت اور مہدویہ کے عمل کی صداقت و حقانیت صاف طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ اور عوام کو محض اس فتویٰ کی وجہ سے پہلے مرتبہ یہ معلوم ہو سکا کہ اس طریقہ پر عمل پیرا ہونا خدا و رسولؐ کے احکام کے عین مطابق اور نہایت ضروری ہے۔ اس پر عمل کرنا گوناگوں فوائد کا موجب اور اس سے غفلت کرنا یا اس کو ننگ و عار سمجھنا آخرت کی فضیحت و رسوائی اور وہاں کے نقصان و خسران کا باعث ہے۔

سوال کے دوسرے جزو کا جواب جو دیا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ عمل محرم کی دس تاریخ پر موقوف و منحصر نہیں ہے۔ البتہ یہ عمل ۱۰ر محرم کو ہو تو اولیٰ و افضل ہے۔ کیونکہ اس دن کی فضیلت مسلمہ ہے۔ یہ عمل تو روزانہ، ہر ہفتہ اور ہر مہینے ہونا چاہئے۔ اگر سال بھر میں ایک مرتبہ بھی اس طریقہ پر عمل کیا جائے تو پھر بھی غنیمت ہے۔ چونکہ ہماری قوم کا عملدرآمد ۱۰ر محرم پر ہے اس لئے مستفتی یہ سمجھنا چاہتا ہے

کہ آخر برس کے بارہ مہینوں میں صرف ماہ محرم کی اور پھر دس تاریخ کی خصوصیت کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب بھی فتویٰ میں کچھ نہ کچھ دیا جانا ضروری تھا جس سے مستفتی کی تشفی ہو سکے۔ اس لئے یوم عاشورہ کے فضائل ومناقب پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی تھی۔ جن کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ابن جوزی وشوکانی وغیرہ نے اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ ذیل میں مختصر طور پر اس شبہ کو رفع کیا جاتا ہے۔

ماہ محرم اور یوم عاشورہ دونوں کی فضیلت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے چنانچہ امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کی ہے کہ

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ماہ رمضان کے بعد اللہ کے مہینہ یعنی ماہ محرم میں روزہ رکھنا افضل ہے''

صحیح مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ رمضان کے روزوں کے بعد کون سے روزے افضل ہیں تو فرمایا ''محرم میں روزہ رکھو کیونکہ یہ اللہ کا مہینہ ہے''

ترمذی میں ہے کہ ''حضرت علیؓ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ ماہ رمضان کے بعد کون سے مہینہ کے روزے رکھیں جائیں۔ حضرت علیؓ نے کہا یہی سوال ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے بھی کیا تھا اور اس وقت میں موجود تھا۔ حضرت نے فرمایا تھا کہ اگر تم رمضان کے بعد روزے رکھنا چاہتے ہو تو ماہ محرم کے روزے رکھو کیونکہ یہ اللہ کا مہینہ ہے اس مہینہ میں ایک دن ایسا ہے کہ ایک قوم کی توبہ اللہ نے اس دن قبول فرمائی ہے اور ایک دوسری قوم کی توبہ بھی اسی دن قبول فرمائے گا''

ان احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ محرم کو شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) فرمایا ہے اور ماہ محرم میں جس یوم کی فضیلت بیان فرمائی ہے اس سے یوم عاشورہ مراد ہے۔

یہ تو ماہ محرم کی فضیلت ہوئی۔ یوم عاشورہ کی فضیلت میں صاف طور پر بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ

''رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ فرمایا یہ روزہ کیسا؟ یہود نے کہا یہ مبارک دن ہے اس دن موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو اللہ نے ان کے دشمن (فرعون) سے نجات دی تھی اور اس دن خود

حضرت موسیٰؑ نے روزہ رکھا تھا۔فرمایا تم سے زیادہ موسیٰ کے حقدار ہم ہیں۔ چنانچہ حضرت نے یوم عاشورہ کا روزہ رکھا اور دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا''

ابوداؤد میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''موسیٰؑ نے دشمن سے نجات پانے کے شکریہ میں روزہ رکھا تھا ہم اس دن (یوم عاشورہ) کی تعظیم کے خیال سے روزہ رکھتے ہیں'' اس فرمان سے یوم عاشورہ کی عظمت وفضیلت ثابت ہے۔

ابن ابی شیبہ میں ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ

''عاشورہ کے دن روزہ رکھو یہ ایسا دن ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی اس دن روزہ رکھتے تھے پس تم کو بھی روزہ رکھنا چاہئے''

دیلمی اور بزاز نے ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''عاشورہ کا دن تم سے پہلی امتوں کا یوم العید تھا تم اس دن روزہ رکھو''

بخاری ومسلم میں ہے کہ

''عاشورہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے خود روزہ رکھا اور دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا''

عاشورہ کے دن روزہ رکھنے کی فضیلت میں صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ

''رسول اللہ ﷺ سے عاشورہ کے روزہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا اس ایک دن کا روزہ گذشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے''

ترمذی میں ابوقتادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''مجھے خدائے تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ یوم عاشورہ کے روزہ کو ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بنادے گا'' حاصل یہ ہے کہ

(۱) مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی کی احادیث سے ماہ محرم کا شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) ہونا ثابت ہے۔

(۲) بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی حدیثوں سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عاشورہ کے دن خود روزہ رکھتے اور دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم فرماتے تھے۔

(۳) ابوداؤد کی روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس دن کو بزرگ سمجھتے تھے۔

(۴) ابن ابی شیبہ و دیلمی اور بزاز کی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ انبیائے سابقین بھی اس دن روزہ رکھتے تھے اور یہ دن امم سابقہ کا یوم العید تھا۔

(۵) امام مسلم اور ترمذی کی حدیث سے ثابت ہے کہ یوم عاشورہ کے ایک روزہ سے سال بھر کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

چونکہ فتویٰ میں اس طوالت کی گنجائش نہ تھی اور ماہ محرم اور یوم عاشورہ کے روزہ کی فضیلت بیان کرنا مقصود نہ تھا اس لئے ان میں سے کسی حدیث سے بھی استنباط نہیں کیا گیا۔ البتہ بعض ایسی روایتیں فتویٰ میں لی گئی تھیں کہ جن سے صرف یوم عاشورہ کی فضیلت صاف طور پر متبادر ہے۔ چنانچہ شیخ خمرادری کی کتاب ''نفحات نبویہ فی فضائل عاشوریہ'' کے حوالہ سے لکھا گیا تھا کہ

''یوم عاشورہ کی فضیلت میں بہت سے آثار مروی ہیں ان کے منجملہ آدم علیہ السلام کی توبہ اسی دن قبول ہوئی۔ عرش و کرسی' آسمان و زمین' سورج' چاند' تارے اسی دن پیدا کئے گئے۔ جنت اسی دن پیدا کی گئی۔ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اسی دن پیدا ہوئے' اور اسی دن نمرود کی آگ سے نجات پائے۔ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اپنے دشمن (فرعون) سے اسی روز نجات پائے۔ فرعون اور اس کے ساتھی اسی دن دریائے نیل میں غرق ہوئے۔ نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر اسی دن ٹھیری' سلیمان علیہ السلام کو ایک بڑی حکومت اسی دن عطا کی گئی۔ یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ سے اسی دن نکالے گئے۔ اسی دن یعقوب علیہ السلام کو ان کی بینائی لوٹائی گئی' یوسف علیہ السلام کنویں سے اسی دن نکالے گئے۔ ایوب علیہ السلام نے اسی دن بیماریوں سے شفا پائی' آسمان سے زمین پر پہلی بارش اسی دن ہوئی''

یہ تمام واقعات صحیح ہیں ان کی صحت میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔ شیخ خمرادی نے اپنی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ ان تمام واقعات کا دسویں محرم کو واقع ہونا احادیث مرفوعہ سے ثابت ہے بلکہ انہوں نے آثار کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے علاوہ یوم عاشورہ کے فضائل صحابہ اور تابعین وغیرہ کے اقوال سے ماخوذ ہیں۔ فتویٰ میں بھی یہی احتیاط کی گئی ہے۔ اور

ان تمام مذکورہ واقعات کے دسویں محرم کو واقع ہونے کی روایت کو احادیث صحیحہ کی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا فتنۂ فرعون سے نجات پانا اور رسول اللہ ﷺ کا اس دن کو متبرک سمجھ کر روزہ رکھنا اور دوسروں کو حکم دینا۔ اسی طرح عاشورہ کے روزہ کی فضیلت میں فرمایا کہ یہ ایک روزہ سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ محرم شہر اللہ ہے اس مہینہ میں ایک دن (یوم عاشورہ) ایسا ہے کہ اس میں ایک قوم کی توبہ کو اللہ نے قبول فرمایا ہے۔ یہ سب فضائل بخاری ومسلم اور دوسری کتب صحاح سے ثابت ہیں۔ باقی واقعات کا عاشورہ کے دن واقع ہونا اقوالِ صحابہ وتابعین سے ثابت ہے۔ ابن جوزیؒ کا معیار صحت بہت اونچا ہے۔ یہ اکثر صحیح حدیثوں کو بھی غلط کہہ دیتے ہیں۔ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی اپنی کتاب ''ماثبت بالسنۃ'' میں ان کا قول نقل کر دیا ہے۔ شوکانی علمائے اہل حدیث سے ہیں اپنے مسلک کے سوا اکثر حدیثوں کی بے وجہ تضعیف کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے تو قیامت دسویں محرم کو آنے میں بھی شبہ کیا ہے۔ حالانکہ احادیث سے ثابت ہے۔ اور'' **فیه تقوم الساعة**'' کے الفاظ ملتے ہیں کہ قیامت عاشورہ کے دن آئے گی۔ امام قرطبی وغیرہ نے یہ روایتیں لکھی ہیں۔ اسی لئے بزرگانِ مہدویہ کی عادت تھی کہ دس محرم کو طلوع آفتاب سے پہلے بولا چالا معاف کرایا کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آفتاب مغرب سے طلوع ہو' توبہ کا دروازہ بند اور قیامت قائم ہو جائے۔

سیدالشہداء کربلا حضرت امام حسینؓ کے بوقت شہادت بولا چالا معاف کرانے پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر یہ روایت کسی کتاب میں نہیں ہے تو مضائقہ نہیں۔ فتویٰ کی بناء بھی اس واقعہ پر نہیں رکھی گئی ہے۔ صرف ایک احتمال بتایا گیا ہے کہ ہمارے پاس دسویں تاریخ کا تعین اس وجہ سے بھی ہوسکتا ہے۔

تاریخی واقعات میں مورخین کی عادت ہے کہ کسی واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں کسی کو مختصر۔ اور کسی واقعہ کو غیر ضروری اور غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ضابطہ یہ ہے کہ

''عدم ذکر شئی سے عدم شئی لازم نہیں آتا''

کوئی سنّی یا شیعی مورخ حضرت امام حسینؓ کے اس عمل کو لکھے یا نہ لکھے۔ لیکن ہمارے پاس یہ روایت مسلسل چلی آرہی ہے اور یہ عمل حضرت امام حسینؓ کے شایانِ شان اور قرآن وحدیث کے عین

مطابق ہے۔ جدّ والائے حسین' سید الثقلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی وفات سے پہلے اس پر عمل فرمایا تھا۔ اگر امام حسینؓ نے شہادت سے قبل اپنے جدّ محترم اروا حنا فداہ کی سنت پر عمل کیا تو تامل کی وجہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس عمل کی نسبت اس مخصوص دن' امام حسینؓ کی طرف صحیح وثابت ہے۔ ہم دوسروں کی تصویب وتوثیق کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم تو ''صاحب البیت ادریٰ کافی البیت'' (گھر کی بات گھر والے بہتر جانتے ہیں) کے موقف میں ہیں۔

قوم مہدویہ کے بعض اہل ارشاد خانوادوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت امام ہمام مہدی موعود علیہ السلام نے عاشورہ کے دن بولا چالا معاف کرایا ہے۔ اس روایت کے لحاظ سے یہ عمل حضرت امامنا مہدی موعود علیہ السلام کی اتباع میں اسی دن کیا جاتا ہے اور کیا جانا ضروری ہے۔ معترض نے بھی بولا چالا معاف کرانے کو قومی تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن شبہ صرف یہ ہے کہ یہ قومی عمل جس یوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس یوم کے فضائل وضعی ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ یوم عاشورہ کی فضیلت منصوصی ہے۔ اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ فتویٰ میں عاشورہ کے دن جن واقعات کے وقوع پذیر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی آثار صحابہ وغیرہم سے ثابت ہیں۔ یہ سب واقعات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایمانیات اور اعتقادات سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ وعظ وبیان' ترغیب وترہیب اور خطابیات سے ان کا تعلق ہے۔ اگر ان میں کچھ ضعف بھی فرض کیا جائے تو علماء نے لکھا ہے کہ فضائل اعمال میں احادیث ضعیفہ سے استدلال جائز ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے بعض واقعات اور دیگر امور دسویں محرم کو واقع ہونا صحیح مان لیا جائے تو دین میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے نہ کسی امر منصوصی کا خلاف لازم آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

زیارتِ قبور

حسب احکام شرع شریف زیارت قبور مندوب ومستحب ہونے میں ائمہ مجتہدین سے کسی امام کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں چاروں ائمہ کا متفقہ مذہب یہ لکھا ہے کہ

زیارة القبور مندوبة للاتعاظ وتذکیر الآخرة

یعنی'' پندوموعظت حاصل کرنے اور آخرت کو یاد کرنے کے لئے قبروں کی زیارت کرنا مندوب ہے''

جس کام کے کرنے پر عند اللہ ثواب ملے اور اس کے ترک پر مواخذہ نہ ہو اس کو فقہ کی اصطلاح میں سنت ومستحب یا مندوب کہتے ہیں۔

ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے زیارت قبور سے منع کیا تھا پھر اجازت دے دی۔ ابن ماجہ میں عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ

کت نهیتکم عن زیارة القبور فزوروا القبور فانها تزهد فی الدنیا وتذکر الآخرة

ترمذی میں بریدہؓ سے روایت ہے۔ **فزوروها فانها تذکر الآخرة**

ابوداؤد میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ **فزورو القبور فانها تذکر الآخرة**

مصنف ابن ابی شیبہ میں انسؓ سے روایت ہے۔

نهی رسول اللهؐ عن زیارة القبور ثم قال زوروها ولا تقولوا هجرا

مستدرک میں انسؓ سے روایت ہے۔

کنت نهیتکم عن زیارة القبور الا فزورو ها فانها ترق القلب وتدمع العین وتذکر الآخرة ولا تقولوا هجرا

ان مذکورہ احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

'' میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کیا تھا لیکن اب اجازت دیتا ہوں کیونکہ زیارتِ قبور

دلوں کو نرم کرتی ہے اس سے آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ وہ دنیا سے بے رغبت کرتی اور آخرت کو یاد دلاتی ہے۔ مگر قبرستان میں غیر ضروری اور لغو باتیں نہ کرو''

ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے زیارت قبور کا عام حکم دیا ہے لہذا مرد اور عورت دونوں اس حکم میں شریک ہیں اور دونوں کے لئے زیارتِ قبور کی اجازت ثابت ہے۔ علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں۔

'' زیارت قبور کی ممانعت جس طرح عام تھی اس کی اجازت بھی عام ہے۔ جب ممانعت منسوخ اور اجازت عام ہوگئی تو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے زیارت قبور جائز ہے۔ (ترجمہ از عمدۃ القاری شرح بخاری)

بعض فقہاء کے پاس زیارتِ قبور عورتوں کے لئے مکروہ و ناجائز ہے۔ اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس کو ابن ماجہ ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ

ان رسول الله ﷺ لعن زوارات القبور

یعنی'' رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے''

لیکن خود امام ترمذی نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے

ان هذا كان قبل ان يرخص النبیؐ فی زيارة القبور فلما رخص دخل فی رخصة الرجال والنساء

یعنی'' رسول اللہ ﷺ نے زیارتِ قبور کی اجازت دینے سے پہلے عورتوں کے بارے میں اس طرح فرمایا تھا۔ لیکن جب زیارت قبور کی اجازت دے دی تو عورتیں بھی اس اجازت میں داخل ہیں''

امام ترمذی کے اس بیان کی تائید بخاری شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ'' رسول اللہ ﷺ نے قبرستان میں ایک عورت کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا'' خدا سے ڈر اور صبر کر'' وہ آپؐ کو پہچانتی نہ تھی اس نے کہا جو مصیبت مجھ پر پڑی ہے وہ آپ پر نہیں پڑی۔ لوگوں نے کہا یہ تو نے کیا کہا اور کس سے کہا۔ یہ تو رسول اللہ ﷺ تھے۔ وہ دوڑی ہوئی آئی اور معذرت چاہی۔ حضرت نے اس کو صبر ہی کی تلقین فرمائی۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ عینی عمدۃ القادری میں لکھتے ہیں۔

" انه لم ینة المراة المذکورة عن زیارة قبور میثها وانما امرها بالصبر والتقویٰ فدل علی الجواز

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو زیارت قبور سے منع نہیں فرمایا بلکہ صبر اور تقویٰ کا حکم دیا ہے یہ عورتوں کے لئے زیارت قبور جائز ہونے کی دلیل ہے''

حافظ عسقلانی فتح الباری شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

''وفیه جواز زیارت القبور مطلقاً سواء کان الزایر رجلا او امراة''

یعنی ''اس حدیث سے مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے زیارت قبور کا جائز ہونا ثابت ہے''

علامہ عینی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ قبرستان سے آ رہی تھیں عبداللہ بن ملیکہ نے کہا یا ام المومنین کہاں سے آ رہی ہو۔ فرمایا اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی زیارت کے لئے گئی تھی کہا رسول اللہ ﷺ نے تو عورتوں کو زیارت قبور سے منع فرمایا تھا۔ عائشہؓ نے کہا ہاں منع فرمایا تھا لیکن بعد میں اجازت دیدی تھی۔

مسلم شریف میں ہے کہ عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جب میں زیارت کے لئے قبرستان جاؤں تو مجھے کیا کہنا چاہئے فرمایا اس طرح کہو۔

" السلام علی اهل الدیار من المومنین والمسلمین ویرحم الله المستقدمین منا والمستاخرین وانا انشاء الله بکم لا حقون''

یعنی ''سلام ہو تم پر مومنوں اور مسلمانوں کی بستی میں رہنے والو ہمارے اگلوں اور پچھلوں پر اللہ رحم کرے ہم انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔''

اس حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو نہ صرف اجازت دی بلکہ زیارتِ قبور کا طریقہ بھی تعلیم فرمایا ہے۔

امام ترمذی نے عورتوں کے لئے زیارت قبور کی کراہیت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ

" قال بعضهم انما کره زیارت القبور فی النساء لقلة صبر هن وکثرة جزعهن''

یعنی ''بعض لوگوں نے کہا ہے کہ عورتوں کے لئے زیارت قبور اس وجہ سے مکروہ ہے کہ ان

میں صبر وضبط کا مادہ کم ہوتا ہے اور جزع وفزع زیادہ کرتی ہیں۔امام قرطبی لکھتے ہیں۔

" اذا امن من جمیع ذلک فلا مانع من الاذن لھن لان تذکر الموت یحتاج الیہ الرجال والنساء" (حاشیہ ابن ماجہ)

یعنی"اگر ان میں سے کسی بات کا اندیشہ نہ ہوتو عورتوں کیلئے زیارت قبور میں کوئی امر مانع نہیں ہے کیونکہ موت کو یاد کرنا جس طرح مردوں کیلئے ضروری ہے اس طرح عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے"

اس آہ وزاری کی استثنائی صورت کے علاوہ عام طور پر فقہائے حنفیہ کا فتویٰ یہی ہے کہ اگر عورتیں قبرستان میں جا کر آہ وزاری نہ کریں اور امور نامشروع کی مرتکب نہ ہوں تو عورتوں کے لئے زیارت قبور بلا کراہیت جائز ہے۔فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ

اختلف المشائخ فی زیارۃالقبور للنساء قال شمس الائمۃ السرخسیؒ الاصح انہ لا باس بھا

یعنی"فقہاء کا اختلاف ہے کہ زیارت قبور عورتوں کے لئے جائز ہے یا نہیں شمس الائمہ سرخسیؒ نے فرمایا کہ صحیح قول یہی ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے"درالمختار میں لکھا ہے۔

لا باس وبزیارۃ القبور ولو للنساء

یعنی"زیارت قبور میں کوئی مضائقہ نہیں ہے عورتیں بھی کر سکتی ہیں"

علامہ شامی اس کی شرح میں ردالمختار میں لکھتے ہیں کہ

قیل تحرم علیھن والاصح ان الرخصۃ ثابتہ لھن

یعنی"بعض کے پاس عورتوں کے لئے ناجائز ہے لیکن صحیح قول یہی ہے کہ عورتوں کے لئے زیارتِ قبور کی اجازت ثابت ہے"بحرالرائق میں لکھا ہے

وصرح فی المجتبیٰ بانھا مندوبۃ وقیل تحرم علی النساء والا صح ان الرخصتہ ثابتۃ لھما

یعنی"کتاب مجتبیٰ میں لکھا ہے کہ زیارتِ قبور مندوب ہے۔بعض لوگ عورتوں کے لئے ناجائز کہتے ہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے جائز ہے"

مراقی الفلاح میں لکھا ہے۔

وقیل تحرم علی النساء والا صح ان الرخصة ثابتة للرجال والنساء فتندب لهن ایضاً علی الاصح

یعنی ''بعض لوگ عورتوں کے لئے ناجائز کہتے ہیں لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اجازت ہے اور دونوں کے لئے سنت ہے اور اسی پر فتوی ہے''

امام طحطاوی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ان محل الرخصه اذا کانت الزیارة علی وجه لیس فیه فتنة والاصح ان الرخصه ثابتة الرجال والنساء لان سیدة فاطمة رضی الله عنها تزور قبر حمزةؓ کل جمعة وکانت عائشة رضی الله عنها تزور قبرا فیها عبد الرحمن بمکة

یعنی ''عورتوں کے لئے زیارت قبور کو جانا اس وقت جائز ہے جب کہ ان کے جانے میں فتنہ وفساد نہ ہو۔

اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کو زیارت قبور کی اجازت ہے۔ چنانچہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت حمزہؓ کی زیارت کے لئے (مدینہ سے کوہِ احد کے دامن میں) ہر جمعہ کو اور عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ میں اپنے بھائی عبدالرحمٰنؓ کی زیارت کے لئے (جنت المعلیٰ) کو جاتی تھیں۔

غرض احادیث صحیحہ اور اقوال فقہا سے ثابت ہے کہ زیارت قبور مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے مندوب اور مستحب ہے۔ اس کی فضیلت اور ثواب و برکت کو دوسرے عوارضات کی بناء پر ترک نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً اس قبرستان میں عورتوں اور مردوں کا اختلاط ہوتا ہے۔ تو اس کی اصلاح ہونی چاہئے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مرد ایسے وقت نہ جائیں کہ عورتیں زیارت کر رہی ہوں۔ اور عورتیں ایسے وقت جانے سے احتراز کریں جب کہ وہاں مرد موجود ہوں۔ یا مردوں اور عورتوں کا وقت علیحدہ علیحدہ مقرر کیا جائے۔ اسی طرح دوسری نامناسب باتوں کی اصلاح اور ان کا تدارک بھی حکمت اور پند وموعظت سے ممکن ہے۔ لیکن نہ مرد خود جانا چھوڑیں نہ عورتوں کو قبرستان میں آنے سے منع کریں۔ یہ دونوں باتیں مناسب نہیں ہیں۔ دونوں کو شرعی آداب کے ساتھ برکاتِ زیارت سے مستفید ہونے کا

مساوی حق ہے۔علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں۔

لا تترک العمل لما یحصل عندھا من منکرات ومفاسد کاختلا ط الرجال بالنساء وغیر ذالک لان القربات لاتترک لمثل ذلک بل علی الانسان فعلھاوانکار البدع وازا لتھا ان اکمن''(ردالمختار)

یعنی'' زیارت کے موقع پر بعض منکرات ومفاسد کا جیسے مردوں اورعورتوں کے اختلاط اور دوسری نامشروع باتوں کی وجہ سے زیارت کونہیں چھوڑنا چاہئے۔کیونکہ زیارت ایک کارثواب ہے اور اس کوان باتوں کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا۔بلکہ جہاں تک ممکن ہوسکے ان بدعات کی اصلاح اور ان کا ازالہ کیا جائے''

پس عورتوں کے لئے بھی زیارت قبور جائز بلکہ مندوب ومستحب ہے۔مگر شرط یہ ہے کہ عورتیں قبرستان میں شرعی پردہ کے ساتھ جائیں۔منکرات ومفاسد سے پرہیز کریں اور نامشروع کام مثلاً آہ وزاری' چراغ افروزی اور دوسرے امور کا جن کی شریعت میں اجازت نہیں ہے ارتکاب نہ کیا جائے۔ بلکہ اپنی موت کو یاد کریں۔مُردوں سے عبرت پذیر ہوں۔عزیز واقارب اور دوسرے مومنین اہل قبور کے لئے دعائے مغفرت کریں اور بزرگانِ دین کے مزارات سے برکت حاصل کرنے کی نیت رہے۔

طریقہ زیارت کے بارے میں فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ

''زیارت کو جانے سے پہلے اپنے گھر میں دو رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے۔ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور آیۃ الکرسی ایک ایک بار اور سورۂ اخلاص تین بار پڑھے اور اس نماز کا ثواب میت کو بخشے۔ خدائے تعالیٰ میت کی قبر کو منور کرے گا اور نماز پڑھنے والے کو ثواب کثیر عطا فرمائے گا۔راستہ میں فضول باتوں اور کاموں میں مشغول نہ ہو۔قبرستان میں داخل ہوتو جوتے نکالدے قبلہ کی طرف پیٹھ اور میت کے چہرہ کی طرف منہ کرکے یہ سلام پڑھے۔

السلام علیکم یا اھل القبور من المسلمین والمومنین انتم لنا سلف ونحن لکم تبع وانا ان شاء اللہ بکم لا حقون یرحم اللہ المستقدمین منا والمستاخرین لنساء اللہ لنا ولکم العافیۃ بغفراللہ لنا ولکم ویرحمنا اللہ وایا کم

اس سلام سے فارغ ہوکر قبر کی بائیں طرف قبلہ رخ کھڑے ہوں اور سورہ فاتحہ' آیۃ الکرسی' سورہ اذا زلزلت الارض اور سورۂ الھا کم التکاثر پڑھ کر میت کو اس کا ثواب بخشیں''

فتاویٰ مذکور میں لکھا ہے کہ

''زیارت کے لئے روز دوشنبہ' پنجشنبہ' جمعہ اور شنبہ افضل ایام ہیں۔ جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ اور شنبہ کے دن طلوع آفتاب کے بعد پنجشنبہ کے دن اول روز یا آخر روز بہترین اوقات ہیں۔ شب براءت' عشرہ ذوالحجہ یوم عاشورہ اور دوسرے متبرک ایام میں زیارت قبور مستحب ہے''

ردالمختار میں لکھا ہے کہ

''قرآن مجید کی جو بھی سورتیں اور آیتیں سہولت اور آسانی سے پڑھ سکتے ہیں پڑھ کر میت کو ثواب پہنچائیں۔ درالمختار میں ایک حدیث کے حوالہ سے لکھا ہے۔

''قبرستان میں (۱۱) مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر اہل قبور کو اس کا ثواب پہنچانا اجر عظیم کا باعث ہے''

علامہ عینی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ

''قبرستان میں سورۂ یٰسین پڑھی جائے تو خدائے تعالیٰ اس روز اہل قبور کے عذاب میں تخفیف کرے گا''

زیارتِ قبور کے وقت قبروں پر پھول اُتارنا بھی مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ مالکیہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ حنفیہ وشافعیہ نے اس کو مستحسن لکھا اور جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ بنائے اختلاف وہ حدیث ہے جس کو امام بخاری نے عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''رسول اللہ ﷺ دو قبروں پر سے گزرے' آواز سنی' فرمایا ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور یہ عذاب بھی کسی بڑے گناہ پر نہیں بلکہ صرف اتنی سی بات پر ہے کہ ایک شخص پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا اور دوسری چغل خور تھا۔ حضرت نے کھجور کی ایک شاخ کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ایک ٹکڑا ہر قبر پر رکھ دیا۔ صحابہ نے وجہ پوچھی تو فرمایا مجھے امید ہے کہ جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں گی ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی''

بعض شارحین حدیث نے جن میں مالکیہ بھی ہیں اس عمل کو حضرت کی خصوصیت قرار دے کر

دوسروں کو اس پر عمل کرنے سے منع کیا ہے۔ حالانکہ حضرت نے اس کو اپنی ذات سے مخصوص کیا ہے اور نہ امت کو اس پر عمل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اسی واسطے علامہ عینی حنفی شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

قلت لو کان ذلک من خصائة لبینه

یعنی ''اگر یہ عمل حضرت کی ذات سے مخصوص ہوتا تو آپ ارشاد فرما دیتے''

حافظ عسقلانی شافعی نے اپنی شرح بخاری میں لکھا ہے کہ ایک صحابی بریدۃ الخصیبؓ نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر کھجور کی دو ٹہنیاں رکھی جائیں اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو عمل فرمایا وہ حضرت کی ذات سے مخصوص ہوتا تو بریدہؓ اس پر عمل نہ کرتے چنانچہ حافظ نے لکھا کہ

لان شرو عیتها ثبت یفعله صلی الله علیه و سلم

یعنی ''قبر پر کھجور کی ٹہنی رکھنے کی مشروعیت رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے''

علامہ عینی عمدۃ القاری شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ یہ کچھ کھجور کی ٹہنی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ کسی بھی درخت کی ٹہنی اور پتے وغیرہ سے یہ مقصد پورا ہوسکتا ہے۔

علامہ نے بالکل صحیح کہا' اس موقع پر صرف سبزی اور تازگی کی ضرورت ہے البتہ کھجور کی ٹہنی بہت دیر میں خشک ہوتی ہے اور اس وقت حضرت کو یہی فراہم بھی ہوئی تھی۔ عرب میں جس طرح کھجور کا درخت بکثرت ہوتا ہے اور بسہولت اس کی ٹہنیاں مل جاتی ہیں۔ اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ سہولت وکثرت کے ساتھ ہمارے ملک میں ہم کو پھول دستیاب ہوجاتے ہیں اس لئے کھجور کی ٹہنی کے بجائے پھول یا دوسرے سبز پتوں کا استعمال غلط نہیں ہوسکتا۔ حدیث کا مغز صرف یہی ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ جب تک یہ پتے خشک نہ ہوں گے ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی اور حضرت نے اس عمل کو اپنی ذات سے مخصوص کیا اور نہ دوسروں کو منع فرمایا۔ اس حدیث سے کسی درخت کے پتے یا پھول قبروں پر اُتارنے کا جواز ثابت ہے اور ایصال ثواب کے دوسرے طریقوں کے منجملہ یہ طریقہ بھی ضرور جائز بلکہ مسنون ہے۔ اکثر فقہاء نے اس کو جائز کہا ہے اور اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح میں لکھا ہے۔

قبرستان میں سے سبز گھانس اور درخت وغیرہ کاٹنا مکروہ ہے۔ کیونکہ جب تک یہ چیزیں تازہ رہتی ہیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور جہاں اللہ کا ذکر اور تسبیح ہوتی ہے وہاں اللہ کی رحمت نازل ہوتی

ہے اور میت سکون وراحت حاصل کرتی ہے''

اس کی شرح میں امام طحطاوی نے اسی حدیث کا ذکر کیا اور لکھا ہے کہ حضرت نے قبر پر کھجور کی ٹہنی رکھی تھی اس سے ہر وہ چیز مراد ہوسکتی ہے جس میں رطوبت ہو۔اس کے بعد لکھا ہے:

وقد افتی بعض الائمة من متاخری اصحابنا بان ما اعتید من وضع الریحان والجریدة سنة الهذاالحدیث (حاشیہ مراقی الفلاح)

یعنی''متاخرین حنفیہ میں سے بعض ائمہ نے فتویٰ دیا ہے کہ عام طور پر قبروں پر پھول اور سبز پتے وغیرہ رکھنے کی جو عادت ہے وہ اس حدیث شریف کی وجہ سے سنت قرار پاتی ہے''

فتاویٰ قاضی خاں میں بھی لکھا ہے کہ قبرستان سے سبزی اور بھاجی پالا دور نہ کیا جائے۔علامہ ابن عابدین نے بحرالرائق میں لکھا ہے کہ قبرستان سے سبزی اور کچی گھانس دور کرنا مکروہ ہے یہ جب تک تازہ ہیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے اور میت اس سے راحت پاتی ہے۔ اور پھر حدیث مذکور کا حوالہ دیا اور لکھا ہے

ویو خذ من ذلک ومن الحدیث ندب وضع ذلک للاتباع ویقاس علیه ما اعتید فی زماننا من وضع اغصان الآس ونحوه وصرح بذلک ایضا جماعة من الشافعیة

یعنی''اس وجہ سے کہ تازہ پتیاں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور نیز اس حدیث شریف کی وجہ سے کچی ٹہنیاں قبر پر رکھنا مندوب ہے۔ ہمارے زمانہ میں قبروں پر پھول وغیرہ ڈالنے کی جو عادت ہے اس کی اجازت کا قیاس بھی اسی حدیث پر کیا جاتا ہے۔حنفیہ کے علاوہ فقہائے شافعیہ کی ایک جماعت بھی پھول وغیرہ قبروں پر ڈالنے کو جائز کہتی ہے''

ظاہر ہے کہ جب قبرستان میں خودرو گھانس' سبزی وغیرہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور اس تسبیح کی وجہ سے اللہ کی رحمت نازل ہوتی اور میت کو اس سے سکون ملتا ہے تو اگر وہی چیز اللہ کا نام لے کر قبر پر رکھی جائے اور اللہ سے دعا کی جائے کہ جب تک یہ تر وتازہ ہے اس کی تسبیح کا ثواب میت کو پہنچتا رہے تو یہ عمل منشائے حدیث کے عین مطابق ہے۔اسی واسطے فقہاء کے پاس رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں قبروں پر کسی بھی درخت کی تازہ ٹہنی یا پتے رکھے جاسکتے ہیں کیونکہ بہ نسبت خشک پتوں کے تر پتوں میں

تسبیح کامل ہوتی ہے اور ان میں ایک قسم کی زندگی پائی جاتی ہے۔ پھول میں تو خوشبو اور تری دونوں چیزیں ہیں۔فقہانے اسی کو ترجیح دی ہے۔فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے۔

وضع الوردو الریا حین علی القبر حسن

یعنی ''قبر پر گلاب اور دوسرے پھول ڈالنا مستحسن ہے''

مذکورہ حدیث شریف' فعل صحابی حضرت بریدہؓ اور اقوالِ فقہا کی موجودگی کے باوجود بعض حنفی علماء کا قبر پر پھول اتارنے کو ناجائز و بدعت کہنا ناقابلِ التفات ہے۔ جب بعض مسائل میں علامہ ابن تیمیہ و ابن قیم کے تفردات نہ چل سکے تو ان لوگوں کی مجرد رائے' قیاس وخیال اور تاویلاتِ بارده کی کیا اہمیت ہے۔ محدثین اور فقہائے کرام کا ایک جم غفیر اس کو جائز و مستحسن کہتا ہے اور یہی ہمارا مذہب ہے۔حضرت مہدی علیہ السلام کے حضور میں میاں حاجی مالیؒ کی قبر پر پھول اتارے گئے ہیں جو چالیس روز تک تازہ رہے۔اور حضرت امامنا علیہ السلام کے دفن کے بعد سب سے پہلے بندگی میراں سید محمود ثانی مہدیؓ اور پھر سب اصحاب کرام ومہاجرین عظام نے مزار اقدس پر پھول اتارے ہیں۔ ہمارے پاس اس کا جواز واستحسان ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

زیارتِ قبور کے وقت ہاتھوں کو اُٹھانا بھی درست ہے۔امام غزالیؒ احیاء العلوم میں ابوامامہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک صحابی حضرت انس بن مالکؓ نے رسول اللہ ﷺ کی تربت پاک پر حاضری دی اپنے ہاتھوں کو اٹھایا اور حضرت پر سلام بھیجا۔

ابتدائے مضمون میں لکھا جاچکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اولاً زیارتِ قبور سے منع فرمایا تھا اور پھر اجازت دے دی۔اس کی وجہ یہی تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں شرک کے جو اثرات زندگی کے تانے بانے میں رچ گئے تھے ان کو کلیتہً دور کیا جائے۔ کفار ومشرکین بت پرستی کریت اور قبروں پر سجدہ کرتے تھے۔ جب اسلام مستحکم اور ان کے دلوں میں راسخ ہوگیا اور قبور کی عبادت اور ان کو سجدہ گاہ بنالینے کا اندیشہ باقی نہ رہا تو اجازت دے دی اور فرمایا زیارتِ قبور آخرت کو یاد دلاتی اور دنیا سے بے رغبت کرتی ہے۔ یہ ممانعت اور پھر اجازت' اس بات کی دلیل ہے کہ دراصل زیارتِ قبور مباح تھی اور ممانعت عارضی تھی۔اس حقیقت کے پیش نظر زیارت قبور مسنون طریقہ سے ہونی چاہئے جو شائبہ شرک

سے پاک ہو۔ رسول اللہ ﷺ قبرستان بقیع واُحد کو تشریف لے جاتے اور صرف دعائے مغفرت فرماتے تھے۔ عام قبور کی زیارت کا یہی طریقہ ہے۔

اہل سیر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کو بوسہ دیا ہے۔ (سیرۃ محمدیہؐ)

مشہور صحابی ابوایوب انصاریؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے مزار اقدس پر اپنے رخساروں کو ملا ہے۔ حضرت امامنا مہدی علیہ السلام دولت آباد تشریف لائے اور مومن عارفؒ کی قبر کے سرہانے کچھ دیر قبلہ اور مراقب تشریف فرما رہے ہیں۔ گلبرگہ میں شیخ سراج الدین جنیدیؒ کے روضہ میں ایک ہفتہ اعتکاف فرمایا ہے۔

محدثین کے ضابطہ کے موافق فضائل اعمال میں ضعیف احادیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے یہہ روایات تو اہل سیر کے نزدیک صحیح ہیں۔ لہذا اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مزارات کا احترام کرتے اور ان سے برکت حاصل کرنے میں حرج نہیں ہے۔ ان مذکورہ امور کے سوا قبر پرستی کی ہر صورت سے احتراز لازم ہے۔

زیارت قبور سے کبھی غافل نہ رہنا چاہئے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ مرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت کی جائے اور لوگوں کے حقوق اگر ان کے ذمہ رہ گئے ہیں تو ان کو ادا کرنے یا معاف کرانے کا اہتمام کیا جائے تا کہ ان کو عذاب قبر اور عذاب آخرت سے نجات ملے۔ علامہ قسطلانی مواہب لدنیہ میں اوسطِ طبرانی سے نقل کرتے ہیں کہ

عن انسؓ قال رسول الله ﷺ امتی امة مرحومة تدخل قبور ها بذنوبها وتخرج من قبور ها لا ذنوب عليها تمحص عنها باستغفار المومنين لها.

یعنی ''انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت' امتِ مرحومہ ہے۔ گناہوں کے ساتھ قبر میں داخل ہوتی ہے اور گناہوں سے پاک وصاف ہوکر قبر سے اٹھے گی کیونکہ مومنین کی دعائے مغفرت کی وجہ سے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ غرض زیارت مرنے والے کے لئے ایک نعمت ہے۔ فقط

☆☆☆☆☆

عورت اور زیارت قبور

پچھلے چند دنوں سے حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد سے خطوط کے ذریعہ اس بات کی خواہش کی جارہی ہے کہ عورتوں کے لئے زیارت قبور کے جواز اور عدم جواز پر تفصیلی مضمون سپرد قلم کیا جائے چونکہ میری صحت ان دنوں اس قابل نہیں ہے کہ میں کوئی تفصیلی مضمون تحریر کرسکوں اس لئے استفسار کنندوں کی تشفی کے لئے مختصراً چند باتیں بطور وضاحت لکھدی جاتی ہیں۔

ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے مردوں اور عورتوں کو زیارت قبور سے منع فرمایا تھا اور پھر اجازت دیدی چنانچہ فرمایا۔'' **انی نھیتکم عن زیارۃالقبور الا فزوروھا فانھا تذکرۃ الآخرۃ**''یعنی'' میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کیا تھا لیکن اب زیارت کرو کیونکہ زیارت قبور آخرت کو یاد دلاتی ہے''

حدیث مذکورہ سے مستدرک میں حضرت انسؓ سے مروی ہے' نیز ابن ماجہ میں عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوہریرہؓ سے ترمذی میں' بریدہؓ سے ابوداؤد میں ابوہریرہؓ سے مصنف ابن ابی شیبہ میں انسؓ سے اور دوسری کتب حدیث میں باختلاف الفاظ مروی ہے۔ جن کا خلاصہ یہی ہے کہ'' قبور کی زیارت آخرت کی یاد دلاتی ہے'' ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے زیارت قبور کا عام حکم دیا ہے۔ اور اس میں عورتوں کا استثناء نہیں ہے۔ جس طرح آیت کریمہ'' **اقیمو الصلوٰۃ واتو الزکوٰۃ**'' میں جمع مذکور کے صیغوں کے باوجود نماز وزکوٰۃ کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کو شامل ہے اسی طرح حدیث شریف میں'' **فزوروھا**'' اگرچہ جمع مذکور کا صیغہ ہے مگر اس میں مرد اور عورت دونوں شریک ہیں۔ اور دونوں کے لئے زیارت قبور کا حکم ثابت ہے۔ کیونکہ قبروں سے پند وموعظت حاصل کرنا اور زیارت قبور سے آخرت کو یاد کرنا جس طرح مردوں کے لئے ضروری ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں۔

الاباحۃ فی زیارۃ القبور اباحۃ عموم کما کان النھی عن زیارتھا نھی عموم ثم ورد النسخ فی الاباحۃ علی العموم مجائز للرجال والنساء زیارۃ القبور

(عمدۃ القاری صفحہ ۷۶)

یعنی ''جس طرح زیارت قبور کی ممانعت عام تھی اس کی اجازت بھی عام ہے جب ممانعت منسوخ اور عام اجازت ہوگئی تو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے زیارت قبور جائز ہے''

بعض فقہا کے نزدیک زیارت قبور عورتوں کے لئے مکروہ و ناجائز ہے۔ اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جن کو ابن ماجہ اور ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ

'' ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن زوارت القبور''

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے''

لیکن خود امام ترمذی نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ

ان هذا كان قبل ان يرخص النبى فى زيارة القبور فلماء رخص دخل فى رخصة الرجال والنساء

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے زیارت قبور کی اجازت دینے سے پہلے عورتوں کے بارے میں اس طرح فرمایا تھا لیکن جب زیارت قبور کی اجازت دیدی تو عورتیں بھی اس اجازت میں داخل ہیں''

امام ترمذی کے اس بیان کی تائید بخاری شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبرستان میں ایک عورت کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا ''خدا سے ڈر اور صبر کر'' وہ آپؐ کو پہچانتی نہ تھی اس نے کہا جو مصیبت مجھ پر پڑی ہے وہ آپ پر نہیں پڑی۔ لوگوں نے کہا یہ تو نے کیا کہا اور کس سے کہا۔ یہ تو رسول اللہ ﷺ تھے۔ وہ دوڑی ہوئی آئی اور معذرت چاہی۔ حضرت نے اس کو صبر ہی کی تلقین فرمائی۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ عینی عمدۃ القادری میں لکھتے ہیں

'' انه المدينة المراةالمذكور عن زيارة قبورميتها وانما امرها بالصبر و التقوىٰ فدل على الجواز

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو زیارت قبور سے منع نہیں فرمایا بلکہ صبر اور تقویٰ کا حکم دیا ہے یہ عورتوں کے لئے زیارت قبور جائز ہونے کی دلیل ہے''

حافظ عسقلانی فتح الباری شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

''وفيه جواز زيارت القبور مطلقاً سواء كان الزاير رجلا او امراة''

یعنی ''اس حدیث سے مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے زیارت قبور کا جائز ہونا ثابت ہے''

علامہ عینی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ قبرستان سے آ رہی تھیں عبداللہ بن ملیکہ نے کہا یا ام المومنین کہاں سے آ رہی ہو۔ فرمایا اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی زیارت کے لئے گئی تھی کہا رسول اللہ ﷺ نے تو عورتوں کو زیارت قبور سے منع فرمایا تھا۔ عائشہؓ نے کہا ہاں منع فرمایا تھا لیکن بعد میں اجازت دیدی تھی۔

مسلم شریف میں ہے کہ عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جب میں زیارت کے لئے قبرستان جاؤں تو مجھے کیا کہنا چاہئے فرمایا اس طرح کہو۔

" السلام علی اھل الدیار من المومنین والمسلمین ویرحم اللہ المستقدمین منا والمستاخرین وانا انشاء اللہ بکم لا حقون"

یعنی" سلام ہو تم پر مومنوں اور مسلمانوں کی بستی میں رہنے والو ہمارے اگلوں اور پچھلوں پر اللہ رحم کرے ہم انشاءاللہ تم سے ملنے والے ہیں۔"

اس حدیث سے جو بات مترشح ہوئی ہے وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو زیارت قبور کے لئے جانے سے منع نہیں کیا نہ صرف اجازت دی بلکہ طریقہ زیارت کی بھی تفہیم وتعلیم فرمائی۔ امام ترمذی نے عورتوں کے لئے زیارت قبور کی کراہیت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ

" قال بعضھم انما کرہ زیارت القبور فی النساء لقلۃ صبر ھن وکثرۃ جزعھن"

یعنی" بعض لوگوں نے کہا ہے کہ عورتوں کے لئے زیارت قبور اس وجہ سے مکروہ ہے کہ ان میں صبر وضبط کا مادہ کم ہوتا ہے اور جزع وفزع زیادہ کرتی ہیں۔

امام قرطبی لکھتے ہیں۔ **" اذا امن من جمیع ذلک فلا مانع من الاذن لھن لان تذکر الموت یحتاج الیہ الرجال والنساء"** (حاشیہ ابن ماجہ)

یعنی" اگر ان میں سے کسی بات کا اندیشہ نہ ہو تو عورتوں کے لئے زیارت قبور میں کوئی امر مانع نہیں ہے کیونکہ موت کو یاد کرنا جس طرح مردوں کے لئے ضروری ہے اس طرح عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے"

اس آہ وزاری کی استثنائی صورت کے علاوہ عام طور پر فقہائے حنفیہ کا فتویٰ یہی ہے کہ اگر عورتیں قبرستان میں جا کر آہ وزاری نہ کریں اور امور نامشروع کی مرتکب نہ ہوں تو عورتوں کے لئے زیارت قبور بلا کراہیت جائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ

اختلف المشائخ فی زیارۃالقبور النساء قال شمس الائمۃ السرخسی الاصح انہ لا باس بھا

یعنی ''فقہا کا اختلاف ہے کہ زیارت قبور عورتوں کے لئے جائز ہے کہ نہیں شمس الائمہ سرخسی نے فرمایا کہ صحیح قول یہی ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

درالمختار میں لکھا ہے ''**لا باس وبزیارۃ القبور ولو للنساء**''

یعنی ''زیارت قبور میں کوئی مضائقہ نہیں عورتیں بھی کرسکتی ہیں''

علامہ شامی اس کی شرح میں ردالمختار میں لکھتے ہیں کہ **قیل تحرم علیھن والاصح ان الرخصتہ ثابتۃ لھن** یعنی بعض کے پاس ناجائز ہے لیکن صحیح قول یہی ہے کہ عورتوں کے لئے زیارت قبور کی اجازت ثابت ہے۔ بحرالرائق میں لکھا ہے کہ ''**وصرح فی المجتبیٰ بانھا مندوبۃ وقیل تحرم علی النساء والاصح ان الرخصۃ ثابتہ لھما**'' یعنی ''کتاب مجتبیٰ میں لکھا ہے کہ زیارت قبور مندوب ہے بعض لوگ عورتوں کے لئے ناجائز کہتے ہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے جائز ہے۔

مراقی الفلاح میں مرقوم ہے۔

وقیل تحرم علی النساء والاصح ان الرخصۃ ثابتۃ للرجال والنساء فتندب لھن ایضاً علی الاصح

یعنی ''بعض لوگ عورتوں کے لئے ناجائز کہتے ہیں لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اجازت ہے۔ اور دونوں کے لئے سنت ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

امام طحطاوی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

''**ان محل الرخصۃ اذا کانت الزیارۃ علی وجہ لیس فیہ فتنۃ والاصح ان الرخصہ ثابتۃ للرجال والنساء لان سیدۃ فاطمۃ رضی اللہ عنھا تزور قبر حمزۃؓ کل جمعۃ وکانت عائشہ رضی اللہ عنھا تزور قبرا فیھا عبد الرحمن بمکۃ**''

یعنی ''عورتوں کے لئے زیارت قبور کو جانا اس وقت جائز ہے جب کہ ان کے جانے میں فتنہ وفساد نہ ہو۔ اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کو زیارت قبور کی اجازت ہے۔ چنانچہ

فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت حمزہؓ کی زیارت کے لئے (مدینہ سے کوہِ احد کے دامن میں) ہر جمعہ کو اور عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ میں اپنے بھائی عبدالرحمٰنؓ کی زیارت کے لئے (جنت المعلیٰ) کو جاتی تھیں۔

غرض احادیث صحیحہ اور اقوال فقہا سے ثابت ہے کہ زیارت قبور مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے مندوب اور مستحب ہے۔ اور فقہا کی اصطلاح میں سنت و مستحب یا مندوب اس فعل کو کہتے ہیں کہ جس کے کرنے پر عنداللہ ثواب ملے اور اس کے ترک پر مواخذہ نہ ہو۔

اب رہی یہ بات کہ عورتوں کے زیارت قبور کے نکلنے میں خرابیوں کا اندیشہ ہے جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آ رہا ہے تو اس سلسلہ میں یہ بات جاننی چاہئے کہ علامہ ابن عابدین ردالمختار میں لکھتے ہیں۔

لا تترک العمل لما یحصل عندھا من منکرات ومفاسد کاختلا ط الرجال بالنساء وغیر ذالک لان القربات لاتترک لمثل ذلک بل علی الانسان فعلھاو انکار البدع وازا لتھا ان اکمن''

یعنی ''زیارت کے موقع پر بعض منکرات ومفاسد کا جیسے مردوں اور عورتوں کے اختلاط اور دوسری نامشروع باتوں کی وجہ سے زیارت کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ کیونکہ زیارت ایک کارثواب ہے اور اس کو ان باتوں کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہوسکے ان بدعات کی اصلاح اور ان کا ازالہ کیا جائے''

پس معلوم ہوا کہ مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاط کے اندیشہ کو جواز بنا کر کسی مندوب ومستحب فعل کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں ایسی صورتیں ضرور اختیار کی جانی چاہئے کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ جیسے مرد ایسے وقت نہ جائیں جب عورتیں زیارت کر رہی ہوں اور عورتیں ایسے وقت جانے سے احتراز کریں جب وہاں مرد موجود ہوں یا پھر مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ وقت مقرر کیا جائے ایک اور شرط یہ بھی رکھی جاسکتی ہے کہ جب زیارت کے لئے قبرستان جائیں تو پوری طرح سے شرعی پردہ میں رہیں۔ ونیز وہ منکرات ومفاسد سے پرہیز کریں نامشروع کام مثلاً آہ وزاری، چراغ افروزی اور امور کا جن کی شریعت میں اجازت نہیں ہے قطعاً ارتکاب نہ کرنے پائیں۔

☆☆☆☆☆

نمازِ قصر

نماز قصر کے معنی یہ ہیں کہ چار رکعت والی ظہر' عصر اور عشاء کی صرف فرض نمازیں سفر میں دو رکعت پڑھی جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

واذا ضربتم الی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ او خفتم ان یفتنکم الذین کفروا (النساء۱۰۱)

یعنی'' جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم نماز میں سے کچھ کم کرو اگر تم کو ڈر ہو کہ کافر تم کو ستائیں گے''

جس طرح آیت کریمہ سے حالات خوف میں نماز میں قصر کرنے کی اجازت ہے اسی طرح احادیث شریفہ سے حالتِ امن میں بھی نماز قصر کا جواز دو مشروعدت ثابت ہے۔ چنانچہ بعض احادیث سے رسول اللہ ﷺ کا سفر میں پوری نماز پڑھنا بھی پایا جاتا ہے۔ اور قصر کرنے کی روایتیں بھی درج ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث بہت مشہور ہے کہ آپ سفر میں پوری نمازیں پڑھتیں اور فرماتی تھیں کہ **ان النبی ﷺ کان یتم الصلوٰۃ فی السفر ویقصر** یعنی رسول اللہ ﷺ سفر میں نماز پوری بھی پڑھتے تھے اور قصر بھی کرتے تھے۔

حضرت انسؓ سے بھی روایت ہے کہ **اصطوب اصحاب رسول اللہ ﷺ فکان بعضھم یتم وبعضھم یقصر فلا یعیب ھولاء علی ھولاء علی ھولاء** یعنی صحابہ رسول اللہ ﷺ باہم سفر کرتے تھے بعض نمازیں پوری پڑھتے تھے اور بعض قصر کرتے تھے مگر ایک دوسرے پر اعتراض نہ کرتے تھے۔ آیت کریمہ کے مفہوم اور احادیث کے اختلاف اور روایات کی صحت وضعف پر غور وتعمیق کے بعد اب مجتہدین نے جو مسئلہ مستنبط کیا ہے مذہب کہلاتا ہے۔ اور ایک امام کے متبعین اُسی کے پیرو ہیں۔

نمازِ قصر کے مطلقاً جائز ہونے میں کسی امام کو کلام نہیں ہے۔ البتہ اس کی نوعیت میں آئمہ مجتہدین کی مختلف تعبیرات ہیں مثلاً امام اعظمؒ نے نماز قصر کو واجب امام مالکؒ نے سنت' امام شافعیؒ رخصت اور بروایتے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ دونوں نے افضل مانا ہے۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں امام اعظمؒ کا مذہب یہ لکھا ہے۔ **القصر واجب عند نا کذافی الخلاصہ** یعنی ہم احناف کے پاس قصر واجب ہے۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں امام مالکؒ کا مذہب یہ لکھا ہے کہ **اماالمالکیتہ قالوا القصر سنة موکدة اکرمن الجماعة**(ترجمہ) امام مالک کے متبعین کہتے ہیں کہ قصر سنت موکدہ اور نماز باجماعت سے زیادہ تاکیدی ہے۔

امام احمد حنبلؒ کا مذہب یہ لکھا ہے کہ

الحنابلة قالوا القصر جائز وھو فضل من الاتمام ولا یکرہ الا تمام

ترجمہ: امام احمدؒ کے مذہب میں قصر جائز ہے (واجب یا سنت نہیں) البتہ افضل ہے۔ اگر نماز پوری پڑھ لی جائے تو مکروہ نہیں ہے۔

امام شافعیؒ کا مذہب یہ لکھا ہے کہ **الشافعیة قالوا القصر جائز وھو افضل من الاتمام** (ترجمہ) شافعیہ کے پاس قصر جائز ہے اور تمام سے افضل ہے۔ یعنی پوری نماز پڑھنے سے قصر کرنا افضل ہے۔ لیکن صاحب ہدایہ امام شافعیؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ **قال الشافعی فرضہ الاربع والقصر رخصة اعتباراً اللصوم** (ترجمہ) امام شافعیؒ نے فرمایا کہ مسافر پر بھی چار رکعت ہی فرض ہیں اگر وہ قصر کرے تو اس کی اجازت ورخصت ہے۔ جس طرح مسافر کو سفر میں روزہ رکھنا عالیت اور افطار کرنا رخصت ہے۔ اسی طرح مسافر کو پوری نماز پڑھنا عالیت اور قصر رخصت ہے بلکہ بعض فقہائے شافعیہ کے پاس قصر واتمام دونوں فرض ہیں۔ مسافر کو اختیار ہے چاہے تو پوری نماز پڑھے چاہے تو قصر کرے۔ چنانچہ امام ابن رشد اندلسی بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں **ان القصر ولاتمام فرض یخرلہ** (ترجمہ) شافعیہ کے پاس سفر میں قصر کرنا یا پوری نماز پڑھنا دونوں فرض ہیں۔ مصلی جس صورت کو چاہے اختیار کرے۔ غرض صرف امام اعظمؒ کے پاس قصر واجب ہے۔ مگر امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے پاس نماز قصر واجب یا لازم وضروری نہیں

ہے اور نہ ان تینوں آئمہ کے پاس تارکِ قصر گناہگار ہوتا ہے۔ صحتِ قصر کے لئے مسافتِ سفر اور نیت سفر دو اہم شرطیں ہیں۔ نیت کے بغیر پوری دنیا کا سفر کرلے تو اس کے لئے قصر جائز نہیں ہے۔ پوری نماز پڑھنا چاہئے۔ دار المختار میں لکھا ہے۔ **ومن طاف الدنیا بلا قصر قصدٍ لم یقصر** (ترجمہ) جو شخص نیت کے بغیر تمام دنیا کا سفر کرلے تو وہ نماز میں قصر نہ کرے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک دو دو منزل کی نیت سے تمام دنیا کا سفر بھی کرلے تو اس کو قصر کرنا جائز نہیں ہے۔ مسافتِ سفر میں جس میں امام اعظمؒ کے پاس قصر واجب اور دوسرے آئمہ کے پاس جائز ہے اختلاف ہے۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں امام اعظمؒ کا مذہب یہ لکھا ہے۔ **اقل مسافته تتفیر فیها الاحکام میسرة ثلثة ایام** (ترجمہ) کم سے کم مسافت جس میں احکام بدل جاتے ہیں تین دن کا سفر ہے۔ مگر بلحاظ سہولت فقہائے حنفیہ نے تین دن کی مسافت کا اندازہ کر کے اس کو فرسخوں میں تبدیل کیا ہے۔ بعض (۱۵) بعض (۱۸) بعض (۲۱) فرسخ قرار دیتے ہیں۔

امام سرخسی محیط میں لکھتے ہیں کہ **والفتوی علی ثمانیة عشر** یعنی تین دن کے سفر کی مسافت (۱۸) فرسخ ہونے پر فتویٰ ہے۔ فرسخ کے بارے میں دار المختار میں لکھا ہے کہ **الفرسخ ثلثة امیال والمیل اربعة آلاف ذراع** یعنی ایک فرسخ تین میل (شرعی) کا اور ایک میل چار ہزار گز شرعی کا ہوتا ہے۔ گز کے بارے میں لکھا ہے **هو اربع وعشرون اصبعاً** یعنی شرعی گز ۲۴ انگل (انچ) کے مساوی ہے۔ پس ۱۸ فرسخ کے ۵۴ میل شرعی ہوئے۔ انگریزی میل (۱۷۶۰) گز کا اور ایک گز ۳۶ انچ (انگل) کا ہوتا ہے اگر ۴۵ میل شرعی کو انگریزی میلوں میں اور پھر ان میلوں کو کیلو میٹر میں منتقل کریں تو ۵۴ میل شرعی بحذفِ کسرات تقریباً ۹۲ میل انگریزی اور (۱۴۸) کیلو میٹر کے مساوی ہیں۔

پس امام اعظمؒ کے پاس تین دن کی مسافت یعنی (۱۴۸) کیلو میٹر کے سفر کی نیت سے نکلنا نماز میں قصر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس سے کم مسافت کا سفر ہو تو حنفیہ کے پاس قصر جائز نہیں۔

امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے پاس صرف دو دن کی مسافت کی نیت سے نکلیں تو قصر کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ اور اس مسافت کا اندازہ ان آئمہ کے مذہب میں (۱۶) فرسخ کیا گیا

ہے۔ چنانچہ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں لکھا ہے۔

اما شروط صحت القصر فمنها ان یکون السفر مسافة تبلیغ ستته عشر فرسخا یعنی امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کے پاس صورتِ قصر کے لئے اس قدر مسافت کا ہونا ضروری ہے جو سولہ فرسخ کے مساوی ہو۔ تیز رفتار سواریوں کے ذریعہ طئے مسافت میں جو سہولت حاصل ہے اس کے لحاظ سے حضرت امام اعظمؒ کے مذہب کے موافق تین دن کی مسافت یعنی (۱۴۸) کیلومیٹر اور آئمہ ثلثہ کے مذہب کے موافق دو دن کی مسافت یعنی (۱۳۲) کیلو میٹر کا سفر موٹر' ریل یا طیارہ کے ذریعہ کیا جائے اور چند گھنٹوں میں بلکہ آنِ واحد میں یہ مسافت طئے ہو جائے تو اس پر سفر کا حکم اور مسافر کے احکام مرتب ہو جائیں گے۔ چنانچہ کتاب مذکور میں لکھا ہے۔

ولا یشتر طان یقطع هٰذه المسافة فی المرة المذکورة فلو قطعها فی اقل منها ولو فی لحظةِ صح القصر یعنی تین اور دو دن کی مسافت اسی مدت (دو دن یا تین دن) میں طئے کرنا ضروری نہیں ہے اگر کسی نے اس مسافت کو کم مدت میں بلکہ ایک لحظہ میں طئے کر لیا تو قصر کے احکام جاری ہو جائیں گے''

ان تصریحات سے ثابت ہے کہ نماز قصر امام اعظمؒ کے پاس واجب' امام مالکؒ کے پاس سنت' امام احمدؒ کے پاس افضل' لیکن پوری نماز پڑھنا مکروہ بھی نہیں ہے۔ اور امام شافعیؒ کے مذہب میں بعض افضل کہتے ہیں لیکن صاحب ہدایہ نے فرمایا کہ نماز قصر امام شافعیؒ کے پاس رخصت ہے اور پوری نماز پڑھنا عالیت ہے بلکہ امام ابن رشد نے لکھا ہے کہ بعض شوافع اتمام وقصر میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ دونوں فرض ہیں مصلی کو اختیار ہے چاہے تو قصر کرے یا پوری نماز پڑھے۔ ان تمام مباحث سے قطع نظر حضرت امامنا مہدی موعود افضل الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ میں قصر کی مداومت نہیں پائی جاتی۔ جونپور سے ہجرت کرنے کے بعد سے وفات شریف تک ۲۳ سالہ مدت میں صرف بڑلی میں قصر ادا کرنے کی ایک روایت ملتی ہے جس سے جواز ثابت ہوتا ہے۔ وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ غالباً اسی وجہ سے بزرگان مہدویہ نے نماز قصر کی پابندی نہیں فرمائی۔ کیونکہ ان کے سامنے امام شافعیؒ کے مذہب کے علاوہ کہ سفر میں پوری نماز پڑھنا عالیت ہے۔ حضرت مہدی علیہ

السلام کا عمل بھی تھا جس سے وجوب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔''

فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ سنتوں میں قصر نہیں ہے۔ پوری پڑھی جائیں۔ علمائے اہل سنت کا اتفاق ہے اور مہدویہ بھی اس کے قائل ہیں کہ **الحق دائر بین الائمة الاربعة** یعنی حق چاروں آئمہ میں دائر وسائر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر امام کا مذہب بجائے خود صحیح ہے ہر شخص کو صرف اپنے امام کی تقلید کرنا چاہئے۔ مہدویہ بھی تقلید کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن وہ کسی ایک ہی امام کے مقلد اور کسی ایک ہی امام کے مذہب کے مقید نہیں ہیں وہ آئمہ مجتہدین کے اختلافی مسائل میں عالیت اور حزم واحتیاط کا دامن نہیں چھوڑتے۔ عموماً بزرگان دین کی تقلید مسئلہ عالیت کی رہنمائی کرتی رہی ہے۔

علمائے قوم نے بھی اس مسئلہ پر کافی غور وخوض کیا ہے قوم کے مشہور اور مستند علماء حضرت مولانا سید نصرت صاحب، مولانا سید اشرف صاحب شمسی اور بقیۃ السلف حجۃ الخلف حضرت مولانا سید شہاب الدین صاحب اعلی اللہ مقامہم نے کسی طویل سفر میں بھی قصر نہیں فرمایا۔ سفر حج اور سفر فرہ مبارک میں پوری نماز پڑھی اس فقیر ہیچمداں کا بھی یہی عمل ہے۔

غرض نماز قصر تمام آئمہ کے پاس واجب نہیں ہے نہ صرف احناف کا مسئلہ ہے کہ قصر موجب اور تارک گنہگار رہے مہدوی صرف حنفی نہیں ہیں کہ مذہب حنفیہ پر عمل کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اگر مہدوی قصر نہ کریں تو تارک واجب اور گنہگار نہیں ہیں۔ البتہ پوری نماز پڑھنے والے قصر کرنے والوں پر اور قصر کرنے والے پوری نماز پڑھنے والوں پر اعتراض نہ کریں۔

☆☆☆☆☆

نماز ودعائے استسقاء

بتاریخ ۱۴؍جولائی ۱۹۶۶ء مطابق ۲۴؍ربیع الاول ۱۳۸۶ھ بروز پنجشنبہ بوقت ساڑھے پانچ بجے ساعت شام ''بزم مہدویہ'' کی طرف سے جونو جوانانِ قوم کا ایک ادارہ ہے' حظیرہ میاں سید راج محمد علیہ الرحمہ میں نماز ودعائے استسقاء کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور اس نماز کی امامت کے لئے پیشوائے طریقت' مقتدائے رشد وہدایت' افضل العلماء مولانا میاں سید نجم الدین صاحب صدر مجلس علمائے مہدویہ ہند سے درخواست کی گئی تھی جنہوں نے از راہِ کرم قبول فرمایا۔ چنانچہ اس ادارہ کی تشہیر کے مطابق لوگ وقتِ مقررہ پر جمع ہوگئے۔ نمازِ استسقاء کے لئے حظیرہ کے ملحقہ جدید میدان میں کافی صفیں بچھائی گئی تھیں لیکن صفیں کافی نہ ہونے کے باعث شطرنجیوں وغیرہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ میرے اپنے اندازہ کے مطابق معزز حضرات' فقراء کرام اور دیگر برادران قوم کی تعداد' بڑوں اور بچوں کو ملا کر کم وبیش پانچ سو نفوس پر مشتمل تھی۔

نماز استسقاء سے پہلے حضرت افضل العلماء نے فحوئے ومنشاء نماز استسقاء ودعا پر ایک معلومات آفریں مختصر تقریر فرمائی اور پھر اپنی امامت میں نماز استسقاء پڑھائی۔ نمازِ استسقاء کے بعد آپ نے ایک نہایت جامع اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ خطبہ کے بعد' اس دعا کا جو مسنون طریقہ ہے اس کے مطابق آپ نے قبلہ رو ہو کر دعائیں پڑھیں اور سب حاضرین جو صفوں پر قبلہ رو تھے ''آمین'' کہتے گئے۔ نماز اور خطبہ کا یہ سلسلہ ساڑھے پانچ بجے شام سے پونے سات بجے شام تک رہا۔ ختم نماز اور دعا کے بعد کچھ لوگ اٹھ گئے اور کچھ لوگوں نے نمازِ مغرب وہیں ادا کی۔ میں نے بطورِ خاص اس امر کو محسوس کیا کہ حضرت افضل العلماء میاں سید نجم الدین پر دورانِ دعا رقت طاری ہوگئی تھی جس کا اظہار ان کی آواز سے ہو رہا تھا۔

چونکہ دعا جس میں سینکڑوں آدمی شامل تھے' خلوصِ دل سے نکلی تھی' رحمت الٰہی سے مستجاب ہوئی اور کوئی دو گھنٹوں کے اندر اندر بارش کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ کافی دنوں تک جاری رہا۔ جس سے لاحقہ پریشانی کے رفع ہونے کے علاوہ ہر طرف سرسبزی وشادابی کا پتہ چل رہا ہے۔ چونکہ نمازِ استسقاء اور دعاء کے متعلق بہت کم لوگوں کو علم ہے اس لئے میں نے میاں سید نجم الدین صاحب سے ان کا ارشاد کردہ خطبہ حاصل کر کے روئیداد نماز ودعاء کے ساتھ ''نور حیات'' میں اشاعت کے لئے دیدیا ہے تاکہ برادران قوم کے علاوہ دیگر مسلمان حضرات بھی اس مسئلہ سے کماحقہ واقف ہوجائیں۔ (سید محمود یداللّٰہی)

الخطبة الاولٰی

استغفروا لله واتوب اليه تسعاً سبحان محی الاموات وسميت الاحياء ومد برامرالآخرة والاولیٰ سبحان من يعلم ما فی السموٰت العلیٰ وما فی الارض السفلی سبحان من يريكم البرق خوفا وطمعا وينشئی السحاب الثقال ويسبح الرعد بحمده والملائكة من خيفة ويرسل الصواعق فيصيب بها من يشاء وهم يجادلون فی الله وهو شديد المحال . سبحان من يسبح له السموٰات السبع والارض ومن فيهن وان من شئی الايسبح بحمده ولكن لا يفهمون تسبيحهم انه كان حليما غفورا يخرج الحی من الميت ويخرج الميت من الحی ويحيی الارض بعدموتها وكذلک تخرجون سبحان سامع الاصوات باعث الاموات ومجيب الدعوات،ومقدر الاموات والعالم بما كان وبما هو آت سبحان من علاورائی دعلم واجصیٰ وقدر و قضیٰ وحكم وامضیٰ وانه هو اضحک وابكی وانه هوا مات واحييٰ وانه هو يبسط الرزق لمن يشاء من عباده ويقدرله وهو الذی جعل من الماء كل شئی حئی وهو الذی ينزل الغيث من بعد ما قنطوا وينشررحمته وهو الولی الحميد احمده فی جميع الاوقات والآناء واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له مستحق التوحيد والثنا ء واشهد ان محمد عبده ورسوله خاتم الرسل والانبياء واشهد ان محمدا ن المهدی الموعود خاتم الاولياء قد جاء ومضی صلی الله عليهما وعلی آلهما واصحابهما صلاة دائمة بلا انقضاء يا قوم استغفروا ربكم ثم توبوا اليه يرسل السماء عليكم مدرارا،يزد كم قوة الی قوتكم ولاتتولوا مجرمين فاستغفروه ثم توبو اليه ان ربی قريب مجيب ' واستغفرو ا ربكم انه كان غفارا،يرسل السماء عليكم مدرارا ويمدد كم باموال وبنين ويجعل لكم جنات ويجعل لكم انهارا ،فاستغفروه ثم توبوا اليه ان ربی رحيم ودود. استغفر الله ربی واتوب اليه،استغفر الله ربی واتوب اليه ،استغفروا لله ربی واتوب اليه،اللهم ان كثرة الذنوب حجبت هنا غيث سمائک فنتوب اليک ونستغفر ک فسهل لكا فتنا غيثا ها طلا تسيل به الشعاب وتروی به الظواب اللهم ان تهلكنا فبقهيح اعمالنا وان ترحمنا فبرحمتک لا صاغرنا واطفالنا،اللهم اغننا بارسال السحاب وانزال

الامطار' من لجةبحر عميق زخار 'حتى تصلح زروعنا وضروعنا وتفرح به قلوبنا وتفرج به كروبنا الذى لا يكون فيه اضرار اللهم اكتب السلامةوالعافية علينا وعلى سائر المومنين اللهم اجعل هذاالبلدآمنا مطمئنا من كل الآفات والافكار ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين

الخطبة الثانيه

الحمد لله الحمد لله نحمد ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سئيات اعمالنا فمن يهديه الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له'اشهدان لا اله الا الله وحده لا شريک له واشهد ان محمدا عبده ورسوله ' نقرو نصدق ان المهدى الموعود قد جاء ومضى فآمنا به صلى الله عليهما وعل آلهما واصحابهما اجمعين' اما بعد فيا عباد الله المومنين

استسقاء کے معنی لغت میں دوسرے آدمی سے پانی طلب کرنے کے ہیں۔اور شرعی اصطلاح میں خشک سالی اور حبس باراں کے موقع پر خاص خدائے تعالیٰ سے بارش کے لئے دعا کرنے کو استسقاء کہتے ہیں۔ استسقاء یعنی بارش کے لئے خدائے تعالیٰ سے دعا کرنا کتاب اللہ' سنت رسول اللہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔علامہ ابن نجیم نے بحرالرایق میں لکھا ہے۔

وقد ثبت ذلک بالكتاب والسنة ولاجماع اما الكتاب قوله تعالىٰ حكايةعن نوح الخ اما السنة فصح فى الآثار الكثيرة ان النبى صلى الله عليه وسلم استسقىٰ مرارا وكذا الخلفاء بحده' والامة اجمعت عليه خلفا عن سلف من غير نكير

یعنی قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ موجود ہے۔اکثر احادیث شریفہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہا دعا فرمائی ہے۔خلفائے راشدین نے بھی اس پر عمل فرمایا ہے۔اور سلف سے خلف تک امت محمدیہ کا اس کی صحت وضرورت پر اجماع ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے قحط کا عذاب آیا تو نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ

''استغفروا ربكم انه كان غفارا يرسل السماء عليكم مدرارا ويعدد كم باموال وبنين ويجعل لكم جنات ويجعل لكم انهارا''

یعنی''اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہو اور توبہ کرو' وہ غفار یعنی بہت بخشنے والا ہے۔اگر تم توبہ

کرو گے تو وہ آسمان کی دھاریں تم پر چھوڑ دے گا' تمہارے اموال اور تمہاری اولاد کو زیادہ کرے گا۔تمہارے واسطے باغ لگادے گا اور پانی کی نہریں جاری کردے گا۔''

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی عمر تقریباً ایک ہزار سال کی ہوئی ہے۔وہ سینکڑوں سال تک اپنی قوم کو خدائے تعالیٰ کی طرف بلاتے اور توحید کی دعوت دیتے اور گناہوں سے روکتے رہے ہیں۔لیکن وہ لوگ اپنی سرکشی اور طغیانی سے باز نہ آئے۔خدائے تعالیٰ نے ان کی قوم پر عذاب نازل کیا اور ان کو قحط وخشک سالی میں مبتلا کردیا' تالاب خشک ہوگئے' نہریں بند ہوگئیں' ان کے کھیت اور باغ ویران ہوگئے' چارہ نہ ہونے سے مویشی مرگئے' جو زندہ رہے ان کا دودھ خشک ہوگیا' کفر ومعصیت کی وجہ سے مزید عذاب یہ نازل ہوا کہ ان کی عورتیں بانجھ ہوگئیں۔قحط دو قسم کا ہوتا ہے ایک یہ کہ برسات نہ ہو اور پھل پھلاری' ترکاری' میوہ اور غلّہ وغیرہ کم ہوجائے' اس کو قحط الاموال کہتے ہیں۔دوسرا قحط یہ ہے کہ اولاد ذکور ناپید ہوجائے اس کو قحط الرجال کہتے ہیں۔نوح علیہ السلام کی قوم دونوں قسم کے قحط میں مبتلا تھی' زمین بھی خشک تھی کہ غلہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ان کی عورتوں کے رحم بھی بنجر زمین بن گئے تھے کہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔چنانچہ چالیس سال' بروایتے ستر سال تک ان کو کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا۔ ایسے موقع پر نوح علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ **استغفر وا ربکم انه کان غفارا**.....

یعنی'' میں سالہا سال تک تم کو سمجھاتا رہا' لیکن تم نہ مانے اور آخر کار اللہ کا عذاب آ ہی گیا۔اور تم قحط الاموال اور قحط الرجال دونوں میں مبتلا ہوگئے ہو۔اب بھی اگر تم میری بات مانو' اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو' اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو تو وہ بڑا معاف کرنے والا ہے' تمہارے سب پچھلے گناہ معاف کردے گا اور جس خشک سالی میں تم مبتلا ہو دور ہوجائے گی وہ اس طرح کہ

یرسل السماء علیکم مدرارا آسمان سے تمہارے لئے دھواں دھار پانی برسائے گا جس کی وجہ سے تمہارے کھیت اور باغ سرسبز ہوجائیں گے اور **یمددکم باموال وبنین** تمہارے مال اور تمہاری اولاد میں زیادتی کرے گا۔پھل' میوے اور غلہ کی افراط ہوگی جس کا اب قحط ہے' تمہارے جانور فربہ اور دودھ دینے والے ہوجائیں گے۔اور تمہاری شامت اعمال سے تمہاری عورتیں جو بانجھ ہیں وہ پھر سے اولاد ذکور پیدا کریں گی۔

ویجعل لکم خبات ویجعل لکم انهارا

غرض خدائے تعالیٰ تمہارے لئے باغات لگادے گا اور پانی کی نہریں بہادے گا۔

اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام کی قوم ان پر ایمان نہیں لائی تھی' وہ لوگ زراعت پیشہ تھے اور خدائے تعالیٰ نے ان کو امساک باراں کے عذاب میں مبتلا کردیا تھا۔چنانچہ مسلسل تین سال تک پانی کی ایک بوند نہ برسی تھی۔خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ

یا قوم استغفروا ربکم ثم توبوا الیه یرسل السماء علیکم مدرارا ویزدکم قوة الی قوتکم ولا تتولوا امجرمین

یعنی ''اے میری قوم! اپنے پروردگار سے گناہوں کی مغفرت چاہو اور اس کی طرف رجوع وتوبہ کرو وہ تم پر آسمان کی دھاریں چھوڑ دے گا اور تم کو قوت پر قوت دے گا۔ تم مجرموں کی طرح اس سے روگردانی نہ کرو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ایمان لا کر خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کرو گے تو وہ تمہاری اس مصیبت کو دور کر دے گا' تم پر موسلا دھار بارش ہوگی۔ تمہارے باغ اور کھیت لہلہانے لگیں گے۔ مالی وبدنی قوت میں اضافہ ہوگا۔ اولاد میں برکت اور خوشحالی میں وسعت ہوگی۔ ان ظاہری فوائد وبرکات کے علاوہ روحانی وایمانی قوت میں زیادتی ہوگی۔ مگر شرط یہی ہے کہ اس کی بے نیاز درگاہ میں خشوع وخضوع کے ساتھ رجوع ہو جاؤ اور مجرموں کی طرح سرکشی نہ کرو۔

حضرت امام اعظمؒ نے انہی آیات سے استدلال کر کے فرمایا کہ استسقاء کی اصل حقیقت اور روح صرف توبہ واستغفار ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے انزالِ مطر یعنی بارش کو' استغفار پر موقوف رکھا ہے نہ نماز پر۔ چنانچہ نوح اور ہود علیہما السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ بارش چاہتے ہو تو گناہوں سے توبہ کرو اسی بناء پر امام اعظمؒ کے پاس استسقاء میں صرف توبہ واستغفار کافی ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بارش کے لئے نماز کے بغیر بھی دعا فرمائی ہے (مسلم) اور بعض وقت نماز استسقا بھی پڑھی ہے (بخاری) چونکہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پر مواظبت نہیں فرمائی اس وجہ سے امام اعظمؒ نماز استسقاء مع الجماعۃ کو سنت نہیں قرار دیتے' مگر اس کی مشروعیت کے قائل ہیں۔ اور مندوب (مستحسن) فرماتے ہیں۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ) لیکن صاحبین یعنی امام اعظمؒ کے تلامذہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے پاس نماز استسقاء سنت ہے۔ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے پاس نماز استسقاء سنت موکدہ ہے۔ اور امام اعظمؒ جب مشروع ومندوب فرماتے ہیں تو اس لحاظ سے بھی یقیناً دعا مع الصلوٰۃ استسقاء کی ایک مکمل ترین صورت ہے۔ اور فقہائے حنفیہ کا مذہب مختار یہی ہے۔

ائمہ مجتہدین کے اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دونوں عمل ثابت ہیں۔ یعنی طلب باراں کے لئے کبھی بغیر نماز کے صرف دعا فرمائی ہے اور کبھی نماز پڑھی ہے۔ دونوں عمل صحیح اور سنت رسول اللہ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک عمل اہل ظاہر کے لئے ہے اور ایک اہلِ باطن کے لئے' ایک عوام کے لئے ہے ایک خواص کے لئے' ایک وقت تو عائمہ خلاق کو لے کر مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے اور وہاں بھی کبھی نماز کے بعد اور کبھی نماز کے بغیر دعا فرماتے ہیں۔ اور ایک وقت مسجد نبوی میں منبر شریف پر اثنائے

خطبہ میں دعا فرماتے ہیں اور معاً موسلا دھار پانی برسنے لگتا ہے۔ یہ مقام ہر کس وناکس کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ صرف اہل باطن اور خواص کا حصہ ہے۔

بزرگانِ مہدویہ کو باتباعِ رسول کریم ﷺ یہی مقام حاصل تھا' وہ اگر چہ کہ قطب کی طرح اپنے حجروں میں بیٹھے ہوئے تھے مگر ان کی سیر افلاک کے سیاروں پر سبقت رکھتی تھی۔ وہ دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز اور زمانہ کی خوشحالی وخشک سالی سے فارغ البال تھے۔ ذکر وفکر وغیرہ فرائض وواجبات کو چھوڑ کر ان نوافل ومستحبات میں انہماک ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ لیکن بعض وقت متوسلین اور عام بندگانِ خدا کی استدعاء الحاح والتجا سے مجبور ہوجاتے تو جناب رسالت مآب ﷺ کی دعائے منبری کی طرح ان کی ایک جنبشِ لبِ دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لئے کافی ہوجاتی تھی۔ چنانچہ حضرت بندگی میراں سید محمود ثانی مہدیؓ کے خاص نواسہ حضرت بندگی میاں عزیز محمدؒ کی روایت مشہور ہے کہ بیجاپور میں امساک باراں کی وجہ سے قحط ہوگیا تھا اور لوگوں نے آپ سے دعا کرنے کی خواہش کی تھی' چنانچہ حضرت نے توجہ الی اللہ کے بعد فرمایا کہ جاؤ کچھ نذر اللہ کرو پانی برس جائے گا لوگوں نے آپ کے فرمائے ہوئے طریقہ کے موافق نذر اللہ کی تکمیل کی' فقراء ومساکین کو کھلایا اور فوراً پانی برسنے لگا۔

پس جو بزرگانِ دین صاحبانِ حال وقال ومقتدائے کامل تھے ان کو جنگل میں جانے اور نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی وجہ سے ہمارے یہاں نماز استسقاء پڑھنے کی روایت سلف سے منقول نہیں ہے۔ لیکن اس دور انحطاط میں ہم تہی مائگانِ علم وعمل کو ان بزرگوں سے کیا نسبت ہے۔؟ ان پاکانِ خدا نے اپنے مقام کے لحاظ سے دعائے منبری کی طرح ایک سنت رسول اللہؐ پر عمل کیا تھا۔ آج ہم معصیت کاروں کے لئے یہی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دوسری سنت پر عمل کریں' آبادی سے باہر جائیں' نماز استسقاء پڑھیں' توبہ واستغفار کے بعد دعا کریں اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے امیدوار رہیں۔

نماز استسقاء' نمازِ عید کی طرح اذان واقامت کے بغیر جماعت کے ساتھ جہر سے دو رکعت پڑھنا چاہئے۔ البتہ زائد تکبیرات نہ کہی جائیں۔ پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورہ الغاشیہ پڑھنا افضل ہے۔ نماز استسقاء کا وقت امام مالکؒ کے پاس طلوع آفتاب سے زوال آفتاب تک ہے۔ امام اعظمؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے پاس دن بھر اس نماز کا وقت ہے۔ امام شافعیؒ کے پاس اوقات مکروہہ میں بھی جائز ہے۔ لیکن امام اعظمؒ کے مذہب میں جائز نہیں ہے۔ یعنی جن اوقات میں نماز نفل مکروہ ہے ان اوقات میں نمازِ استسقاء بھی نہیں پڑھنی چاہئے۔

نماز عید کی طرح نماز استسقاء میں بھی نماز کے بعد امام خطبہ پڑھے' البتہ فرق یہ ہے کہ عید کے خطبہ

میں ''اللہ اکبر'' متعدد مرتبہ کہتے ہیں۔اس خطبہ میں ''استغفر اللہ و اتوب الیہ'' کہنا چاہئے۔دوسرا فرق یہ ہے کہ جمعہ وعیدین میں خطبہ منبر پر دینا مسنون ہے۔مگر نماز استسقاء کے بعد خطبہ دیتے وقت امام زمین پر کھڑا رہے' منبر پر کھڑا رہنا مکروہ ہے۔امام خطبہ کے وقت قبلہ کی طرف پشت کر کے کھڑا رہے' دو خطبے دے اور خطبۂ جمعہ وعیدین کی طرح درمیان میں ایک مختصر جلسہ (بیٹھک) سے فصل دیا جائے۔امام ابو یوسفؒ کے پاس ایک خطبہ بھی کافی ہے۔

اثنائے خطبہ میں امام کا قلب ردا کرنا یعنی اپنی چادر کو پلٹانا مسنون ہے۔اس کی صورت یہ ہے کہ چادر کا دایاں گوشہ بائیں طرف اور بایاں گوشہ دائیں طرف آجائے اور نیچے کا حصہ اوپر ہوجائے۔فقہاء نے لکھا ہے کہ چادر مربع ہے تو نیچے کا حصہ اوپر کرلیں اور اگر کپڑا مدوّر یعنی گول ہے جیسے عبا' قبا وغیرہ تو دائیں طرف کا بائیں طرف کرلیں۔امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے پاس سب حاضرین کو بھی یہ عمل کرنا چاہئے۔ لیکن امام اعظمؒ کے مذہب میں صرف ایک امام کا قلب ردا کرنا کافی ہے۔دوسرے لوگوں کا اپنی چادروں کو پلٹانا ضروری نہیں ہے۔

خطبہ ختم کر کے امام قبلہ رخ ہوکر دعا کرے ردالمختار میں لکھا ہے۔

الاستسقاء دعاء وذلک ان یدعوا لامام قائما مستقبل القبلة رافعاً یدیه والناس قعود مستقبلین القبلة یومنون علی دعائه

یعنی استسقاء ایک دعا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ امام قبلہ کی جانب منہ کر کے کھڑا ہوجائے۔اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کرے اور سب لوگ قبلہ رو اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے آمین آمین کہتے ہیں۔

نماز استسقاء کو آنے سے پہلے صدقہ دینا' خیر خیرات کرنا مستحب ہے۔حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی قوم میں بدکاری بڑھ جاتی ہے تو خدائے تعالیٰ طاعون کو مسلط کر دیتا ہے اور جب لوگ زکوۃ دینا چھوڑ دیتے ہیں تو خدائے تعالیٰ پانی کو روک لیتا اور ان کو قحط میں مبتلا کر دیتا ہے۔

استسقاء کے لئے پھٹے پرانے' میلے کچیلے' پیوند لگے ہوئے کپڑوں میں نہایت عجز وانکسار اور خشوع وخضوع کے ساتھ آنا چاہئے۔ غریب محتاج' بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لائیں اور ان سے دعاء کروائیں۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ **هل ترزقون وتنصرون الا بضعفاء کم**

یعنی تم میں جو غریب' مفلس اور محتاج لوگ ہیں صرف انہی کی وجہ سے تم کو رزق ملتا ہے اور انہی کی وجہ سے خدائے تعالیٰ تمہاری مدد کرتا ہے۔

اور ایک حدیث میں آیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

لو لا شباب خشع وبها ئم رتع وشيوخ ركع واطفال رضع لصب عليكم العذاب صبا

یعنی ''اگر اللہ سے ڈرنے والے نوجوان' چرنے والے جانور' نماز پڑھنے والے بوڑھے اور دودھ پینے والے بچے نہ ہوتے تو تم پر عذاب نازل ہوجاتا۔

اس لئے بوڑھوں اور بچوں کو بھی استسقاء میں ساتھ لانا مستحب ہے بلکہ چھوٹے شیر خوار بچوں کو ماں سے جدا کر کے لائیں۔اس میں حکمت ومصلحت یہ ہے کہ بچوں کو روتے ہوئے دیکھ کر لوگوں پر رقت طاری ہوگی۔ ان کے خشوع وخضوع میں اضافہ ہوگا اور دریائے رحمت الٰہی جوش پر آجائے گا (ردالمختار)

استسقاء کے موقع پر جانوروں کو بھی جنگل کی طرف ہانکنا مستحب ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ ان بے زبان جانوروں کی وجہ سے بھی مینہ برساتا ہے اور ان کی فریاد کو جو زبان بے زبانی سے کرتے ہیں سن لیتا ہے۔حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ایک مرتبہ پانی نہیں برسا اور قحط ہوگیا تھا۔حضرت سلیمان علیہ السلام دعا کرنے کے لئے سب لوگوں کو لے کر نکلے آپ نے دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنے پاؤں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ بس اب واپس چلو' تمہاری دعا محض اس چیونٹی کی دعاء کی وجہ سے مقبول ہوگئی۔

اگر پانی زیادہ ہوجائے تو کمی کے لئے بھی دعا کرنا جائز ہے۔ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نماز جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے' ایک شخص نے کہا یارسول اللہ ﷺ بارش نہ ہونے سے ہم ہلاک ہوگئے۔ جانور تباہ' کھیتی خراب ہوگئی آپ دعا فرمائیں' اثنائے خطبہ میں حضرت نے دعا کی فرمایا **اللهم اغثنا اللهم اغثنا اللهم اغثنا** اے اللہ پانی برسا' اے اللہ پانی برسا' اے اللہ پانی برسا' راوی کا بیان ہے کہ ہم نے دیکھا کہ فی الفور ابر اٹھا اور پانی برسنے لگا۔چنانچہ آٹھ روز تک برستا رہا۔دوسرے جمعہ کو وہی شخص آیا اور کہا یارسول اللہ ﷺ کثرت بارش سے گھر گر گئے' کھیتی خراب ہوگئی' جان ومال کا نقصان ہورہا ہے۔یہ سن کر آپ نے تبسم کیا اور اسی حالت خطبہ میں پھر دعا فرمائی **اللهم حوالينا ولا علينا اللهم على الا كام والظواب وبطون الا ودية ومنابت الشجر** ''اے اللہ ہم پر نہیں بلکہ ہمارے اطراف واکناف پہاڑوں پر' گھاٹیوں پر' وادیوں اور روئیدگی کے مقامات پر جہاں پانی کی ضرورت ہے وہاں برسا۔راوی کہتا ہے کہ یا تو پانی برس رہا تھا یا فی الفور موقوف ہوگیا۔ مطلع صاف ہوگیا اور آفتاب نکل آیا۔

ایک وقت کی نماز استسقاء کے بعد بارش نہ ہو تو امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے پاس بارش ہونے تک روزانہ نماز کی تکرار کرنا مسنون ہے۔امام اعظمؒ کے مذہب میں اگر نماز استسقاء تین روز متواتر پڑھ لی گئی ہے تو چوتھے روز نہ پڑھی جائے۔

OOO

فوٹو کا شرعی حکم

شریعت اسلامیہ نے بت پرستی کو بیخ و بنیاد سے معدوم ومسدود کرنے کے لئے تصویر سازی یعنی حیوانی صورت گری کو ممنوع قرار دیا ہے۔ انسان کی شکل وصورت بنائی جائے یا جانور کی دونوں ناجائز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذی روح کا مجسمہ بنانا حرام ہے۔ احادیث میں اس کی سخت ممانعت ہے اور حیوانی شکل وصورت بنانے والے کے لئے دردناک عذاب کی وعید آئی ہے۔ کیونکہ اس سے بت پرستی کی بنیاد پڑنے یا بت پرستی کی تائید ہونے کے علاوہ خدائے تعالیٰ کی صفتِ خالقیت میں شرکت کا اِدّعا پایا جاتا ہے۔ غرض خدائے وحدہ لاشریک کے سوا غیر اللہ کی بندگی اور عبادت کرنے کے لئے حیوانی شکل وصورت کے جو مجسمے بنائے جائیں وہ قطعاً حرام اور گناہِ کبیرہ ہیں۔ ان کا بنانا' یا رکھنا اور ان کو تماشہ گاہ بنانا حرام اور ناجائز ہے۔ احادیث میں اس غرض فاسد کے لئے مجسمہ سازی اور صورت گری کی حرمت کو جس شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ اس وقت کے حالات اور عادات کے عین مطابق ہے۔ ابتدائے اسلام میں تصویر سازی پر ایسی ہی سخت تحدید اور تشدید کی ضرورت تھی۔ کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں بت گری اور بت پرستی کا مذاق لوگوں کی زندگی کے تانے بانے میں رچ گیا تھا جس کی حرمت اور عدم جواز کو حضرت شارعِ علیہ السلام نے مختلف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ اور اس ممانعت کی روح صرف یہی ہے کہ بت پرستی کا راستہ ہموار نہ ہو۔ اس لئے حدیث شریف کے وجوہ وفحویٰ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ائمہ دین' فقہائے امت اور علمائے اسلام نے تصویر سازی پر کافی بحث کی اور مسئلہ کو منقح کر دیا ہے۔

عربی زبان میں تصویر کا لفظ عام ہے۔ مجسم اور غیر مجسم دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اہل لغت لکھتے ہیں صوّرہ ای جمل صورۃ وشکلا و سمہ ونقشہ یعنی ''فلاں شخص نے فلاں کی تصویر بنائی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شکل وصورت بنائی یا اس کا نقش ونگار کیا''

اس لحاظ سے لکڑی' پتھر' مٹی' لوہا' تانبا' پیتل' چاندی' سونا اور کپڑے وغیرہ غرض کسی مادی

اورٹھوس چیز سے کوئی شکل وصورت بنائی جائے تو اس کو بھی تصویر کہتے ہیں۔اور اگر کاغذ پر در ودیوار اورفرش وسقف پر دست کاری ونقش ونگاری کی جائے یا کسی کا چربہ اتارا جائے تو یہ بھی تصویر کہلاتی ہے۔لیکن شریعت میں زیادہ شدت وممانعت اُسی وقت ہے جب کہ عبادت کی غرض سے کسی مادّی چیز اورٹھوس اشیاء سے حیوانی شکل وصورت بطورِ مجسمہ بنائی جائے۔اسی لئے فقہانے مجسم صورت گری اور عکاسی کی تقسیم کی اور ہرنوعیت کا حکم علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے۔لیکن عوام نے خلطِ مبحث کر دیا اور ہر قسم کی تصویر کوحرام وناجائز کہنے لگے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ غیر جاندار چیز مثلاً درخت' پہاڑ اور عمارت وغیرہ کی تصویر بالاتفاق جائز ہے۔خواہ مادّی صورت میں ان کا مجسمہ بنایا جائے یا کاغذ وغیرہ پر دستکاری کی جائے۔کیونکہ عموماً ان کی پرستش نہیں کی جاتی اور جاندار کی شکل وصورت خواہ انسان کی ہو یا جانور کی۔اگر مادّی اورٹھوس اشیاء سے ان کا مجسمہ ''غرضِ فاسد''یعنی بت پرستی کے لئے بنایا گیا ہے۔یا بتوں کی طرح نصب کیا گیا ہے اور ان کی عزت وتوقیر کی جاتی ہے تو قطعاً حرام ہے۔کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں لکھا ہے۔

انما حرم فی نظر الشارع اذا کان لغرض فاسد کالتماثیل التی تصنع لتعبد من دون اللہ فان فاعل ھذا لہ اسواء الجزاء وکذلک اذاتربت علیھا تشبہ بالتماثیل اور تذکر لشھوات فاسدۃ فانھا فی ھذہ الحالۃ تکون کبیرۃ من الکبائر فلایحل عملھا ولا بقاؤ ھاولا التفرج علیھا(۵۱/۳)

یعنی''حضرت شارع علیہ السلام نے تصویر کوحرام فرمایا ہے۔اس سے وہ شکلیں اورصورتیں مراد ہیں جوغرض فاسد یعنی غیر اللہ کی عبادت کے لئے بنائی جائیں۔اگر ان اشکال اورصورتوں کا بنانے والا ان کو بت پرستی کی نیت سے بنایا ہے تو وہ بدترین سزا کا مستوجب ہے۔اگر ان اشکال وصور سے بتوں کی مماثلت ومتشابہت پائی جاتی ہے اور شہوات فاسدہ اور خیالات باطلہ کی یاد تازہ ہوتی ہے تو اس صورت میں بھی یہ گناہ کبیرہ ہے۔ایسے مجسمے بنانا' ان کو محفوظ رکھنا' ان کو تفرج کے طور پر استعمال کرنا جائز نہیں ہے''

تفرج کا مطلب یہ ہے کہ عبادت واحترام مقصود ہو بلکہ آرائش وزیبائش اور نمود ونمائش

کے لئے ایسے مجسمے بنانا اوران سے دلچسپی لینا بھی جائزنہیں ہے۔ یہ فعل عبث ہونے کے علاوہ اس میں خدائے تعالیٰ کی صفت خالقیت کی ریس اوراس کی نقل بھی پائی جاتی ہے۔مصوّرِحقیقی خدائے تعالیٰ کی ذات ہے۔علامہ ابن عابدین ردالمختار میں لکھتے ہیں۔

اما فعل التصویر فھو غیر جائز مطلقا لا نہ مضاھاۃ لخلق اللہ تعالیٰ

یعنی''تصویر بنانا مطلقاً ناجائز ہے کیونکہ اس سے خدائے تعالیٰ کی صفتِ خلق میں مشابہت ثابت ہوتی ہے''

اسی بناء پر بعض فقہا نے لکھا ہے کہ ایسے مکان میں دعوت میں جانا جائزنہیں ہے جہاں کسی انسان یا جانور کا صحیح الاعضاء مجسمہ نصب کیا گیا ہو۔حضرت امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے چنانچہ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں لکھا ہے۔

ان لا یکون منصوبۃ فی مکان الولیمۃ صورۃ حیوان وانسان مجدۃ کاملۃ الاعضاء(۴۱/۳)

یعنی''اسی دعوتِ ولیمہ میں جانا جائز ہے جہاں کسی انسان یا حیوان کا کامل الاعضاء مجسمہ نصب نہ کیا گیا ہو''

کامل الاعضاء کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ اگر کسی مجسمہ کا سر یا ایسا کوئی عضو نہ ہو جس کے بغیر زندگی محال ہے تو ایسے مجسمہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔غرض فاسد کے لئے جو مجسمے بنائے جائیں وہ تو حرام وناجائز ہیں لیکن اس حکم سے وہ مجسمے مستثنیٰ ہیں جو غرض صحیح کے لئے بنائے جاتے ہیں۔کتاب مذکور میں لکھا ہے۔

اما اذا کانت لغرض صحیح لتعلم وتعلیم فانھا تکون مباحۃ لا اثم فیھا(۵۱/۳)

یعنی''کسی غرضِ صحیح کے تحت مثلاً تعلم وتعلیم لینے، سیکھنے اور سکھلانے کے لئے انسانی مجسمے بنائے جائیں تو جائز ہے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے''

غرضِ صحیح کی مثال فقہا نے یہ دی ہے کہ مثلاً لڑکیوں کو انسانی شکل وصورت کی گڑیاں بنا کر دینا تاکہ وہ کھیل کے حیلہ میں امور خانہ داری اور تربیت اطفال کے طریقہ سے واقف ہو جائیں، جائز

اور مباح ہے۔ چنانچہ کتاب مذکور میں لکھا ہے۔

لھٰذا استثنیٰ بعض المذاھب لعیب البنات العرائس الصغیرۃ الدّمی فان صنعھا جائز وکذلک بیعھا وشراؤھا لان الغرض من ذلک انما ھو تدریب البنات الصغار علی تربیت الاولاد وھذا الغرض کاف فی اباحتھا (۵۱/۳)

یعنی ''غرض صحیح کے لئے صورت گری جائز ہے۔ اسی لئے بعض فقہا کے پاس لڑکیوں کے لئے چھوٹی چھوٹی گڑیاں بنانا جائز ہے۔ اور ان کی خرید وفروخت بھی جائز ہے۔ کیونکہ لڑکیوں کو اولاد کی پرورش کا طریقہ سکھلانا مقصود ہے اور یہ ''غرضِ صحیح'' صورت گری جائز ومباح ہونے کے لئے کافی ہے۔''

اس طرح گھر کے فرش اور تکیہ وغیرہ پر انسان یا حیوان کی شکلیں بنانا بھی جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ان مورتیوں کی بتوں کی طرح تعظیم وتکریم نہیں کی جاتی۔ بلکہ پاؤں میں روندی جاتی ہیں۔ اس لئے ان تصویروں میں بت پرستی کا شائبہ بھی نہیں ہے چنانچہ لکھا ہے۔

وکذلک اذا کانت الصلواۃ رسومۃ علی ثوب مفروش او بساط او مخدۃ فانھا جائزۃ لا تھا فی ھذہ الحالۃ تکون ممتھنۃ فتکون بعیدۃ الشبہ بالاصنام (۵۱/۳)

یعنی ''فرشِ مکان مثلاً شطرنجی، سوجنی، چادر یا تکیہ پر جاندار کی تصویریں بنی ہوئی ہوں تو جائز ہے کیونکہ اس حالت میں ان کی توہین ظاہر ہے لہٰذا بتوں کی طرح ان کے بارے میں عزت وتوقیر کا شبہ نہیں کیا جاسکتا''

تابوتِ سکینہ میں پیغمبروں کی تصاویر ہونا بھی روایات سے پایا جاتا ہے۔ یہ تابوت حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ان کے فرزند شیث علیہ السلام کے پاس رہا اور پھر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور یعقوب علیہم السلام تک پہنچا۔ یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزندوں کی اولاد کو ''بنی اسرائیل'' کہتے ہیں۔ یہ تابوت بنی اسرائیل کے پاس مدتوں رہا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو آپ کے قبضہ میں آیا۔ موسیٰ علیہ السلام توریت، اپنا کچھ سامان عصا اور نعلین وغیرہ اسی صندوق میں رکھتے تھے۔ ہارون علیہ السلام کا عمامہ بھی اسی میں تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک ظالم بادشاہ جالوت بنی اسرائیل پر غالب آیا اور تابوت سکینہ کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔ بنی اسرائیل نے پیغمبر وقت حضرت شموئیل علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہم پر ایک بادشاہ مقرر کر دیا جائے۔ شموئیل نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ بنایا ہے۔ بنی اسرائیل نے اس کو پسند نہیں کیا۔ حضرت شموئیلؑ سے فرمایا کہ اس کی بادشاہت منجانب اللہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ تابوت سکینہ پھر تم کو واپس مل جائے گا۔ خدائے تعالیٰ نے اس واقعہ کو قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

قال لهم نبيهم ان اٰيته ملكه وان ياتيكم التابوت فيه سيكنة من ربكم وبقية مما ترك اٰل موسىٰ واٰل هارون تحمله الملائكة (پ۲ ع۱۶)

یعنی'' بنی اسرائیل سے ان کے پیغمبر (شموئیل) نے کہا کہ (طالوت) کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں اللہ کی طرف سے تمہارے لئے سکونِ خاطر ہے۔ اور موسیٰ وہارون کی بچی ہوئی کچھ چیزیں اس میں ہیں۔ فرشتے اس صندوق کو اٹھا کر تمہارے پاس لائیں گے''

امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ'' خدائے تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر اس تابوت کو نازل کیا تھا اس میں انبیاء علیہم السلام کی تصویریں تھیں''

بت گری اور بت پرستی تو ہر پیغمبر کے زمانہ میں ممنوع وحرام رہی ہے اس کے باوجود حضرت دانیالؑ کی انگوٹھی جس پر خود ان کے بچپن کی تصویر اور دو شیروں کی تصویریں تھیں جو ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ جب یہ انگوٹھی حضرت عمر فاروقؓ کے ملاحظہ میں پیش ہوئی تو اس کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی اور ابوموسیٰ اشعریؓ کے حوالہ کر دیا۔ (حاشیہ مراقی الفلاح اللطحطاوی)

اس کے علاوہ ایسی چھوٹی چھوٹی تصویریں اور مجسمہ جن کی عادۃً پرستش نہیں کی جاتی' بنائے جاسکتے اور استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ابوہریرہؓ کے پاس جو انگوٹھی تھی اس پر دو مکھیوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں سونے کے سکّے مسکوک کرائے تھے جن

پر (غالباً خود ان کی) تصویر تھی۔ چنانچہ ''النقود الاسلامیہ'' میں لکھا ہے کہ

حضرت معاویه رضی الله عنه' ایضاً ونا نیر علیها تمثال متقلداً سیفا

یعنی ''امیر معاویہ نے جو دینار ضرب کروائے تھے ان پر تصویر بنی ہوئی تھی کہ تلوار لٹکائے ہوئے کھڑے ہیں''

اس سے ثابت ہے کہ چھوٹی چھوٹی مادّی تصویریں (مجسمے) بھی جن کی پرستش نہیں کی جاتی' بنانا جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تصویر والا روپیہ جیب میں ہوتو نماز مکروہ نہیں ہوتی۔

مذکورہ احکام اس تصویر سے متعلق ہیں جو ٹھوس اور مادّی اشیاء سے مجسمہ کے طور پر بنائی جاتی ہے۔لیکن امام اعظمؒ کے مذہب میں کپڑے پر حیوانی شکل وصورت بنائی جائی تو ناجائز وحرام نہیں ہے بلکہ جائز اور مباح ہے۔ چنانچہ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں لکھا ہے۔

الحنفیه قالوا تصویر غیر الحیوان من شجر ونحوه جائز اما تصویر الحیوان فان کان علی بساط رود سارة ردثوب مضروش رد ورق فانه جائز لان الصورة تکون ممتهنه

یعنی ''حنفیہ کہتے ہیں کہ غیر جاندار چیز مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر بنانا جائز ہے اور جاندار چیز مثلاً انسان یا جانور کی تصویر بھی اگر چادر' تکیہ اور فرش پر بنی ہوئی ہو یا کاغذ پر اتاری جائے تو یہ بھی جائز ہے۔ کیونکہ یہ عمل اہانت میں ہیں''

امام مالکؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ چنانچہ کتاب میں لکھا ہے **امااذا لکم تکن مجسدة لتصویر الحیوان والانسان التی ترسم علی الورق والثیاب والحیطان والسقف ونحو ذلک فقیها خلاف فبعضهم یقول انها مباحة مطلقا**

یعنی ''جسم وجسد والی تصویر حرام ہے لیکن اگر مجسد اور مجسم نہ ہو بلکہ کاغذ پر' کپڑوں پر' گھروں کی دیواروں اور چھت پر ہوتو اس میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا مطلقاً جائز کہتے ہیں''

امام شافعی کے پاس اگر پردہ پر تصاویر کا انعکاس ہوتو جائز ہے بشرطیکہ دوسرے غیر مشروع امور نہ پائے جائیں۔ امام احمد حنبلؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

ان اقوال اور روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ از روئے شرع شریف وہی تصویریں ناجائز اور

حرام ہیں جن کو اصنام یا بت کہا جاتا ہے۔ اور جن کو مشرکانِ عرب عبادت و بندگی کے لئے بناتے تھے اگر اس غرضِ فاسد کے لئے اس قسم کی تصویروں اور مجسموں کو بنایا جائے یا بتوں کی طرح ان کی عزت واحترام کیا جائے یا بتوں سے مشابہت کے طور پر ان کو رکھا جائے تو ناجائز وحرام ہے۔ لیکن غرضِ صحیح کی بناء پر مثلاً لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لئے بطور کھلونا بنائی گئی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی مجسم تصویر بنانا جن کی عادتاً پرستش نہیں کی جاتی' جائز ہیں۔ اگر فرش اور تکیہ پر تصویریں ہوں اور پاؤں میں روندی جارہی ہیں تو جائز ہے۔ البتہ تصویروں والا پردہ دروازہ پر پڑا ہو تو جائز نہیں ہے۔

کپڑے کی طرح اگر کاغذ پر بھی انسان اور جانور کی تصویریں بنائی جائیں یا عکس لیا جائے تو جائز ہے۔ اگر فرش اور تکیہ پر تصویریں ہوں اور پاؤں میں روندی جارہی ہیں تو جائز ہے۔ البتہ تصویروں والا پردہ دروازہ پر پڑا ہو تو جائز نہیں ہے کپڑے کی طرح اگر کاغذ پر بھی انسان اور جانور کی تصویریں بنائی جائیں یا عکس لیا جائے تو جائز ہے۔

پس حسبِ احکام شرعِ شریف حصول پاسپورٹ کے لئے یا امتحان گاہ میں داخلہ کے لئے ہال ٹکٹ کے لئے' نیز دفتری ضروریات کے لئے اور کسی تقریب کے موقع پر کاغذ پر عکسی وشعاعی تصویریں لی جائیں تو جائز ہے۔

اسی طرح حسبِ قانون رائج الوقت اگر حج بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کا پاسپورٹ بھی تصویر کے بغیر نہیں مل سکتا تو اس مقصد کے لئے بھی تصویر لی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جب ٹھوس اور مادّی اشیاء سے بنے ہوئے مجسمے غرضِ صحیح کے لئے جائز ہوجاتے ہیں تو یہاں تو غرض دینی بھی پائی جاتی ہے' اور پھر پاسپورٹ پر جو فوٹو چسپاں ہوتا ہے وہ ٹھوس اور مادی اشیاء سے نہیں بنایا گیا ہے بلکہ کاغذ پر دست کاری یا عکاسی ہے اور کاغذی تصویر ائمہ مجتہدین خصوصاً حضرت امام اعظمؒ کے پاس جائز اور مباح ہے۔

☆☆☆☆☆

یورپ کا ذبیحہ

کچھ عرصہ سے خطوط اور استفتاء کے ذریعہ دریافت کیا جارہا ہے کہ جو مسلمان یورپ اور امریکہ میں ہیں وہاں کا گوشت کھاسکتے ہیں یانہیں۔ اس کا جواب دولفظوں میں دیا جاسکتا ہے کہ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ لیکن طالبِ حق کی اس سے تشفی نہیں ہوتی اور یہ خلجان دل میں باقی رہتا ہے کہ جائز ہے تو کیوں ہے اور ناجائز ہونے کی وجہ کیا ہے؟ درآنحالیکہ بعض علمائے مصر وعراق کے فتاویٰ ان کے سامنے ہیں کہ اہل کتاب کا ذبیحہ جائز ہے۔ اس صورت میں مختصر جواب سے ان کے خلجان میں اور اضافہ ہوگا' اس لئے اس صحبت میں ہم اس پر تفصیل سے بحث کریں گے۔ اور یقین ہے کہ جواب کی طوالت' افادیت سے خالی نہ ہوگی اور نتیجتاً یورپ کے ذبیحہ سے متعلق یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ اس کے جواز وعدم جواز کی علت کیا ہے اور ضمناً اکثر وبیشتر مسائل نظر سے گزر جائیں گے جن کی بعض اوقات ضرورت پڑجاتی ہے۔ میں عموماً کسی مسئلہ کے مالہ وماعلیہ اور اس کے متعلقات کو بھی واضح کردیا کرتا ہوں۔ مستفتی اور ناظرین اس پریشاں بیانی سے پریشاں خاطر نہ ہوں میں جس قدر لکھ سکوں اور آپ جس قدر سمجھ سکیں غنیمت ہے۔

از تب د تابم نصیب خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

یورپ کا ذبیحہ جائز ہے یانہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے اولاً ان چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہے کہ ذبح کون کرتا ہے۔ طریقۂ ذبح کیا ہے۔ اور وقتِ ذبح اللہ کا نام لیا جاتا ہے یانہیں۔ اور وہاں بچت وپنر کا انتظام کیا ہے۔

کسی جانور کے حلال ہونے کے لئے خدائے تعالیٰ نے یہ شرط لگادی ہے کہ اس کا تذکیہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل لغیر الله به والمنخنقة والموقوذة والمتردیة والنطیحة وما اکل السبع الا ما ذکیتم وما ذبح علی

النصب (المائدہ آیت ۴)

یعنی ''حرام کیا گیا تم پر مرا ہوا جانور، خون، سور کا گوشت، اور جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ جو گلا گھوٹنے سے اور جو چوٹ سے اور جو اونچے مقام پر سے گر کر مرا ہو اور دوسرے جانور نے اس کو سینگ مارا ہو اور جس کو درندہ نے کھایا ہو (یہ سب حرام ہیں) مگر جس جانور کا تم نے تذکیہ کر لیا ہے (وہ حرام نہیں ہے) اور جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو (وہ بھی حرام ہے)''

خدائے تعالیٰ نے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں سب سے پہلے میتۃ کا ذکر فرمایا ہے جس کو مردار کہتے ہیں۔ یعنی وہ جانور جو ذبح کرنے کے بغیر اپنی موت سے مر جائے وہ حرام ہے کیونکہ اس کا خون اس کے گوشت میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ خون میں سمیت اور گندگی ہوتی ہے لہذا ایسا گوشت مضر صحت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ہی خون کو بھی حرام قرار دے کر اس کی سمیّت اور گندگی کو ظاہر فرما دیا ہے اس سے کفار و مشرکین کے اس اعتراض کا جواب بھی ادا ہو گیا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جس کو اللہ نے مارا ہے وہ تو حرام ہے اور جس کو تم نے مارا ہے وہ حلال ہے۔ اس کے بعد جملہ جانوروں کے منجملہ ایک خاص جانور ''سور'' کو حرام بتا کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ بدترین حیوانات ہے۔ نہ صرف نجاست خوار ہے بلکہ نہایت بے حیا بھی ہے۔ اس میں دیّوثی کی ایسی مذموم اور شرمناک صفت ہے کہ انسان تو انسان کوئی جانور بھی اس کو گوارا نہیں کرتا مگر یہ اپنی مادہ کی آبروریزی پر فخر و ناز کرتا ہے۔ غالباً آج یورپ میں جو بے حیائی ہے اسی کے گوشت کا اثر ہے۔ یورپ میں رہنے والے مسلمانوں کو اس کے گوشت سے انتہائی پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ تینوں اشیاء مردار، خون اور سور ایسی چیزیں ہیں کہ خود ان کی ذات میں گندگی اور نجاست ہے۔ ان کے علاوہ بعض چیزیں عقیدہ کی گندگی سے بھی حرام ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اگرچہ وہ بذاتہ حلال ہے مگر چونکہ اس کی جان مالکِ حقیقی کے نام پر نہیں لی گئی جس کے قبضۂ قدرت میں موت و حیات ہے، لہذا یہ فسادِ اعتقاد بھی مانعِ حلّت ہے۔ اور اس کے بعد واضح فرمایا کہ جو جانور گلا گھوٹنے سے یا چوٹ سے یا بلندی سے گر کر یا کسی جانور کے سینگ مارنے سے مرا ہو یا جس کو درندہ نے کھا لیا ہو، یہ سب چونکہ بغیر تذکیہ یعنی ذبح کے مرے ہیں، اور گندہ خون ان کے گوشت میں پیوست ہو گیا ہے اس لئے میتۃ کے حکم میں ہیں اور حرام ہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ جس طرح

غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے اسی طرح وہ جانور بھی حرام ہے جو کسی تھان پر یعنی مشرکین اور اہل کتاب کی قربان گاہوں اور عبادت گاہوں پر تعظیماً ذبح کیا گیا ہو۔

تذکیہ (ذبح) کی دوصورتیں ہیں۔ایک ذبح ضروری دوسری ذبح اختیاری۔ ذبح ضروری جس کو ذکاۃِ ضروری اور ذکاۃِ اضطراری بھی کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جانور ہمارے قبضہ اور اختیار سے باہر ہے اور حسبِ قاعدہ اس کو ذبح نہیں کیا جاسکتا تو اس کے جسم کو کہیں سے بھی کسی تیز چیز سے زخمی کر کے اس کا خون بہادیا جائے تو شرعاً وہ حلال ہے۔اس کو شکار بھی کہا جاسکتا ہے۔

درالمختار میں لکھا ہے۔

ذکاۃ الضرورۃ جرح وطعن وانہار دونی ای موضع وقع من البدن

یعنی'' ذکاۃ ضروری یا ذبح ضروری یہ ہے کہ (جانور وحشی ہو بے قابو ہو بھاگنے والا چرندہ یا اُڑنے ولا پرندہ ہو تو) اس کے جسم کو کہیں سے بھی زخمی کر کے اس کا خون بہادیا جائے''

اسی طرح کوئی جانور مثلاً گائے' بیل' بکری وغیرہ کنویں میں گر جائے اور ان کو ذبح کرنا ممکن نہ ہو تو ان کو بھی کسی تیز چیز سے اس طرح زخمی کرنا کہ ان کا خون بہہ جائے ان کے حلال ہونے کے لئے کافی ہے۔

دوسری صورت ذبح اختیاری یا ذکاۃِ اختیاری کی ہے وہ یہ ہے کہ جانور ہمارے قبضہ واختیار میں ہے اور ہم شرعی طریقہ سے اس کو ذبح کر سکتے ہیں۔اس کا مسنون طریقہ ایک نحر ہے۔دوسرا ذبح متعارف۔مثلاً اونٹ ہے تو اس کو نحر کر سکتے ہیں۔نحر کا طریقہ یہ ہے کہ اونٹ کے حلق کے نیچے برچھی یا کسی تیز چیز سے زخم لگایا جائے' خون بہہ کر بے طاقتی سے وہ گر پڑے گا۔اسی کی طرف خدائے تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے۔ **فصل لربک وانحر** یعنی نماز پڑھو اور اونٹ کی قربانی دو۔ ذبح اختیاری کی عام اور متعارف صورت یہ ہے کہ حلق اور لبلبی کے درمیان اس طرح کاٹا جائے کہ اس کی چاروں رگیں یعنی دونوں شہ رگ' حلقوم (سانس کی نالی) اور مری (کھانے پینے کی نالی) کٹ جائیں۔ان چاروں رگوں میں سے کم از کم تین کا کٹنا امام اعظمؒ کے پاس ضروری ہے۔اس کو ذکاۃِ اختیاری کہتے ہیں جو جانور مانوس اور قبضہ واختیار میں ہیں ان کو اسی طرح ذبح کرنا لازم ہے۔درالمختار میں لکھا ہے۔

ولا بد من ذبح صید مستانس لان ذکاۃ الاضطرار انما یصار الیھا عند العجر من ذکاۃالاختیار

یعنی'' جو جانور مانوس ہیں ان کو اسی طرح ذکاۃِ اختیاری سے ذبح کرنا ضروری ہے کیونکہ ذکاۃِ اضطراری کی اس وقت حاجت ہے جب ذکاۃ اختیاری متعذر رہو''

ثابت ہوا کہ جو جانور قابو میں ہیں اور جن کو لٹا کر ذبح کیا جاسکتا ہے ان کو کھڑا کر کے گدّھی پر سے کاٹنا غیر شرعی طریقہ ہے۔ دار قطنی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدیل بن ورقا کو منٰی کی پہاڑیوں پر یہ اعلان کرنے کے لئے روانہ فرمایا کہ

''ذبح کرنے کی جگہ جانور کے حلق اور لبلبی کے درمیان ہے''

اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ گردن کے اوپر سے نہ کاٹیں جس سے نخاع (حرام مغز) پہلے کٹ جاتا ہے۔ بلکہ گردن کے نیچے سے کاٹنا چاہئے تاکہ حلقوم (نرخرہ) پہلے کٹے۔ اس ارشاد نبوی میں حکمت یہ ہے کہ بعض وقت جانور نخاع کٹتے ہی مرجاتا ہے اور مرنے کے بعد گردن کی رگیں کٹتی ہیں۔ یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ (ذبح اختیاری میں) حلال ہونے کے لئے گردن کی رگیں کٹنے سے موت واقع ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اسی منشائے اقدس کی تعمیل کرتے ہوئے فقہا نے لکھا ہے کہ

وذبحها من قفاها ان بقيت حية حتى تقطع العروق والالم تحل لموتها بلا ذكاة (درالمختار)

یعنی'' جانور کو گردن پر سے ذبح کرنا مکروہ ہے بشرطیکہ وہ رگوں کے کٹنے تک زندہ رہے۔ اگر رگیں کٹنے تک زندہ نہ رہے (بلکہ نخاع کٹتے ہی مرجائے) تو اس کا کھانا حلال نہیں ہے کیونکہ وہ بغیر ذبح کے مرگیا ہے''

ایسے مانوس جانوروں کو جن کو ذکاۃِ اختیاری کے طریقہ سے ذبح کرنا ضروری ہے یورپ میں مشینوں سے گردن کے اوپر سے کاٹتے ہیں یہ بالکل غیر شرعی طریقہ ہے اور نیز اس امر کا احتمال ہے کہ گلے کی رگیں کٹنے سے پہلے ہی جانور مرگیا ہو ایسی صورت میں ذبیحہ حرام ہوگا۔ اگر رگیں کٹنے سے مرا ہے تو تب بھی مکروہ بکراہتِ تحریمی ہے۔ یورپ کے ذبیحہ کے تعلق سے مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

ذبح ضروری اور ذبح اختیاری کے علاوہ تزکیہ کی ایک اور صورت قرآن مجید میں یہ بتائی گئی ہے کہ سدھائے ہوئے جانور یا درندہ سے شکار کیا جائے اور وہ شکار کو روک رکھے تو اس کو ذبح کرلو اور اگر سدھایا ہوا جانور شکار کو پھاڑ دے اور وہ مرجائے تو اس صورت میں بھی وہ شکار حلال ہوگا۔ کیونکہ

سدھایا ہوا کتا یا چیتا وغیرہ کسی جانور کو پھاڑ دے اور اس کا خون بہہ جائے تو ''**الا ما ذکیتم**'' کا حکم اس کو شامل ہوگا یعنی وہ قطعاً حلال ہے۔ سدھائے ہوئے جانور کے شکار اور اس کے حکم کے بارے میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلموھن مما علمکم اللہ فکلوا مما امسکن علیکم (المائدہ ۵)

یعنی ''جن شکار کرنے والے جانوروں کو تم نے سدھایا ہے اور جن کو تم نے شکار کرنے کی وہ تعلیم دی ہے جو اللہ نے تم کو سکھائی ہے پس وہ جس جانور کو تمہارے لئے روک رکھیں اس کا گوشت تم کھا سکتے ہو''

اس آیت کی تفسیر اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام بخاریؒ وغیرہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

فان امسک علیک فادرکتہ حیا فاذبحہ وان ادرکتہ قدقتل ولم یاکل مند فکلہ وان اکل فلا تاکل

یعنی ''اگر سدھایا ہوا جانور شکار کو تیرے لئے روک رکھے اور وہ تجھ کو زندہ ملے تو اس کو ذبح کر' اگر وہ ہلاک کر دیا ہے لیکن کھایا نہیں ہے تو اس کو تو کھا سکتا ہے اور اگر اس نے کھایا ہے تو اس کو مت کھا''

مطلب یہ ہے کہ سدھایا ہوا کتا' چیتا' باز اور شکرا وغیرہ شکار کو زخمی کر کے ہلاک کر دیتا ہے۔ لیکن خود نہیں کھاتا۔ اگر کھالیا تو معلوم ہوا کہ اس کی تعلیم مکمل نہیں ہے اس نے شکاری کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے شکار کیا ہے اسی حقیقت کو بخاری کی ایک حدیث میں اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ

وان اکل منہ فلا تاکل فانما امسک علی نفسہ

یعنی ''کتے وغیرہ نے کچھ کھالیا ہے تو اس شکار کو تو مت کھا کیونکہ کتے نے اسکو اپنے لئے پکڑا تھا''

اگر بے سدھائے ہوئے کتے وغیرہ نے بھی کسی جانور کو پکڑ لیا اور شکار زندہ مل گیا تو اس کو بھی ذبح کرنا ضروری ہے چنانچہ فرمایا۔

وما مدت بکلبک غیر معلم فادرکت ذکاتہ فکل (بخاری)

یعنی ''غیر تعلیم یافتہ کتے سے تو نے شکار کو زندہ پالیا تو اس کو ذبح کر اور کھالے''

سدھائے ہوئے کتے وغیرہ کا شکار کو زخمی کرنا اور شکار کا خون بہنا ضروری ہے۔خون بہہ کر وہ مرگیا ہے تو حلال ہے۔اگر کتا شکار کا گلا گھونٹ کر مار دے' یا زمین پر پٹک پٹک کر مردہ کردے تو وہ حلال نہ ہوگا۔درالمختار میں لکھا ہے۔

لولم یجرحه لا یوکل مطلقاً وشرط فی الجرح الا دمأ

یعنی''تیر چلانے سے یا کتے وغیرہ کے زخمی کرنے سے خون نہ بہے تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے''

مطلب یہ ہے کہ تیر سے شکار کا زخمی ہوکر مرجانا یا کتے کا اس کو زخمی کر کے مار ڈالنا ذبح کا قائم مقام ہے۔یہی وجہ ہے کہ لٹ یا پتھر سے کسی جانور کو مار دیا جائے تو چونکہ خون خارج نہیں ہوتا اس لئے اس کو حلال نہیں کہا جاتا۔اس قاعدہ کو یاد رکھنا چاہئے کہ شکار کی موت اگر زخم سے یقینی ہے تو حلال ہے۔اگر بوجھ یا چوٹ سے ہے تو حرام ہے۔یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بندوق کی گولی سے جانور مرجائے تو اس کا حکم (موقوذہ یعنی) چوٹ سے مرے ہوئے کا ہے اور وہ حرام ہے۔

درالمختار میں لکھا ہے۔

اوبندقة ثقیلةذات حدة حرم لقتلها بالثقل لا بالحر

یعنی''بھاری باڑ والے غلیلہ سے شکار مرجائے تو حرام ہے کیونکہ شکار بوجھ اور گرانی سے مرا ہے غلیلہ کی باڑ اور تیزی سے نہیں مرا''

بندقہ مٹی کی ایک گولی ہوتی ہے جس کو غلّہ اور غلیلہ کہتے ہیں اور جو غلیل یا کمان میں رکھ کر چھوڑی جاتی ہے اس سے پرندوں کا شکار حرام ہے۔امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ نے بندقہ کے شکار کو حرام فرمایا ہے۔جس طرح بھاری پتھر یا لکڑی سے مارا جائے تو حرام ہے۔کیونکہ جانور زخم سے نہیں بلکہ ضرب وچوٹ سے مرتا ہے۔ائمہ اربعہ کا اس کی حرمت پر اتفاق ہے' امام مالکؒ کی طرف بندقہ کی حلّت جو بعض لوگوں نے منسوب کی ہے وہ غلط ہے۔بندقہ کی طرح بندوق کی گولی کا بھی یہی حکم ہے۔کیونکہ شکار کی موت زخم اور خون بہنے سے نہیں بلکہ بندوق کی شدتِ ضرب سے ہوئی ہے۔جس کو قرآن مجید میں موقوذہ کہا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ بندوق کی گولی بندقہ سے بہت زیادہ سنگین ہوتی اور شدت سے نکلتی ہے اور جانور اس کے بوجھ اور چوٹ سے مرتا ہے اس لئے حرام ہے۔یہ صحیح ہے کہ بندوق بعد کی ایجاد ہے لیکن بندقہ پر اس کا قیاس درست ہے۔بعض لوگوں کا بندوق کی گولی سے مرے

ہوئے جانور کو حلال سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

سدھائے ہوئے کتے' باز' بہری وغیرہ کو شکار پر چھوڑتے وقت یا تیر چلاتے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ عدی بن حاتمؓ حضرت رسول اللہ ﷺ سے شکار کے مسائل اکثر دریافت کرتے رہے ہیں۔ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا۔

اذا ارسلت کلبک فاذکر اسم اللہ فان امسک علیک فادر کتہ حیافاذبحہ وان ادرکت قد قتل ولم یاکل مند فکل (بخاری)

یعنی'' جب تم اپنا کتا چھوڑو تو اللہ کا نام لے لو۔ کتا اگر تمہارے لئے شکار کو روک رکھے اور وہ زندہ ہو تو ذبح کرلو۔ اگر کتے نے اس کو مار ڈالا ہے اور کچھ کھایا نہیں ہے تو تم کھا سکتے ہو''

تیر کا بھی یہی حکم ہے کہ تیر اللہ کا نام لیکے چلایا جائے اگر جانور زخمی ہوکر مرجائے تو اس کا کھانا جائز ہے۔ رسول خدا ﷺ نے عدی بن حاتمؓ سے فرمایا ہے۔

اذا رمیت سھمک فاذکر اسم اللہ علیہ

یعنی'' تم شکار پر تیر چلاتے وقت اللہ کا نام لیا کرو''

ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

ما علمت من کلب اوباز ثم ارسلتہ وقلت اسم اللہ علیہ فکل مما امسک علیک

یعنی'' جس کتے اور باز کو تم نے سدھایا ہے اسکو اللہ کا نام لے کر شکار پر چھوڑو تو وہ جس جانور کو تمہارے لئے روک رکھے تم اس کو کھا سکتے ہو''

ایک دفعہ عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے کتے کو اللہ کا نام لے کر چھوڑتا ہوں اور شکار کے پاس مجھے اور ایک کتا نظر آتا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ میرے کتے نے شکار کو مارا ہے یا دوسرے کتے نے۔ایسی صورت میں کیا حکم ہے؟ فرمایا

فلا تاکل فانما سمیت علی کلبک ولم تم علی غیرہ (بخاری)

یعنی'' تم اس کو مت کھاؤ کیونکہ تم نے اپنے کتے پر اللہ کا نام لیا ہے دوسرے کتے پر نہیں لیا ہے''

مطلب یہ ہے کہ تمہارے کتے کا شکار کو مارنا یقینی نہیں ہے جس پر تم نے اللہ کا نام لیا تھا۔ ممکن ہے دوسرے کتے نے اس کو ہلاک کیا ہو جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ اس لئے احتیاط یہی ہے کہ وہ

شکار نہ کھایا جائے۔

اس فقہی ضابطہ کو یاد رکھنا چاہئے جو ہر موقع پر کام دے گا جس کو فقہا نے اس فرمانِ اقدس سے مستفاد کیا ہے وہ یہ ہے کہ

''محرمات میں امر موہوم امرِ متحقق کے مانند ہے''

اگر شکاری اور سدھائے ہوئے کتے یا باز وغیرہ سے اور تیر سے جانور زخمی ہو جائے اور زندہ ملے تو اس کو ذبح کرنا ضروری ہے۔ دار المختار میں لکھا ہے۔

اذا ادرک المرسل او الرامی الصید بحیاۃ فوق ما فی المذبوح ذکاہ وجوباً

یعنی'' کتے یا باز وغیرہ کو چھوڑنے والا اور تیر چلانے والا شکار کو زندہ پائے اور اس میں حیات' حیاتِ مذبوح سے زیادہ ہو تو اس کو ذبح کرنا واجب ہے''

حیاتِ مذبوح اس زندگی کو کہتے ہیں کہ اس زخم سے شکار کے ایک دن سے زیادہ زندہ رہنے کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ اس قریب الموت شکار کو ذبح نہ کیا جائے تو بھی حلال ہے ذبح کرنا واجب نہیں ہے۔ امام اعظمؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا متفقہ مذہب یہی ہے۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ امام اعظمؒ حیاتِ مذبوح میں شکار کو ذبح کرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ غرض کسی حلال جانور کو ذبح کرنے کے علاوہ سدھائے ہوئے کتے' چیتے یا باز' شکرے وغیرہ سے شکار کیا ہوا جانور بھی کھایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ جانور سدھائے ہوئے ہوں اور ان کو بسم اللہ کہہ کر چھوڑا جائے اور یہ شکار کو زندہ پکڑ کر روک رکھیں یا زخمی کر کے مار ڈالیں' کتے وغیرہ کے تعلیم یافتہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ خود نہ کھائے۔ اگر کتا شکار کو خود کھائے تو وہ سدھایا ہوا نہیں ہے اس کا کھایا ہوا امام اعظمؒ کے پاس حرام اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے پاس حلال ہے۔ اس طرح باز اور شکرے کے تعلیم یافتہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ شکار پر جا رہا ہو لیکن بلایا جائے تو واپس آ جائے البتہ اس کا کھایا ہوا سب ائمہ کے پاس جائز ہے۔ کتا خود کھانے لگے اور باز وغیرہ بلانے سے واپس نہ آئے تو سمجھا جائے گا کہ کتے اور باز نے شکاری کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے شکار پکڑا ہے اس لئے حرام ہے۔

شکار کے علاوہ جن جانوروں کو اللہ نے اور اس کے رسول نے حلال کر دیا ہے ان کو بطور شرعی ذبح کرنا اور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ خدائے تعالیٰ نے ایجابی اور سلبی دونوں

طریقوں سے ذبیحہ کے جائز ہونے کے لئے یہ شرط لگادی ہے کہ

فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ان کنتم بآیاتہ مومنین (سورہ انعام آیت ۱۱۸)

یعنی ''جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے وہ کھاؤ اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان لاتے ہو۔

اور فرمایا۔

ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ وانہ لفسق (سورہ انعام آیت ۱۲۱)

یعنی ''جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے وہ مت کھاؤ بیشک وہ فسق ہے''

ائمہ مجتہدین میں حضرت امام اعظمؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب یہ ہے کہ جس جانور پر مسلمان اللہ کا نام عمداً نہ لے تو اس کا کھانا حرام ہے اور سہواً نہ لے تو جائز ہے۔ امام مالکؒ کے پاس مسلمان سہو ونسیان سے بھی اللہ کا نام نہ لے تو ذبیحہ حرام ہے۔ امام شافعیؒ کے پاس ذبح کرتے وقت مسلمان عمداً بھی اللہ کا نام نہ لے تو ذبیحہ جائز ہے البتہ اللہ کا نام لینا مسنون ہے۔

یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ مشرک ہزار بار بھی اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ جائز نہیں ہے۔ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے ذبیحہ کے متعلق خدائے تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم (المائدہ آیت ۶)

یعنی'' آج کے دن طیبات تمہارے لئے حلال کردئے گئے ہیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے اور تمہارا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال ہے''

اس میں شک نہیں کہ اس آیت میں طعام سے مراد ذبیحہ ہی ہے ورنہ شراب اور سور وغیرہ سب ہی ناجائز چیزیں حلال ہوجائیں گی۔ جب طعام سے مراد ذبیحہ ہے تو اس سے وہی ذبیحہ مراد لینا چاہئے جس کا تذکیہ کیا گیا ہو۔ یعنی اہل کتاب بھی اللہ کا نام لے کر ذبح کریں یا کم از کم ان کے دل میں اللہ کا نام ہو۔ اور خود طیبات کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے دسترخوان پر وہی طعام ہمارے لئے حلال ہے جو طیب ہے ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمان خود باضابطہ شرعی طریقہ سے اللہ کا نام لے کر ذبح کریں تو کھا سکتے ہیں لیکن اہل کتاب کے پاس ناجائز گندہ، نجس اور مردار جانور بھی کھالیا کریں حالانکہ لفظِ طیبات ان سب سے منع کررہا ہے۔

اہل کتاب کے ذبیحہ کے بارے میں ائمہ مجتہدین کا جو اختلاف ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

امام مالکؒ کے پاس مسلمان کے لئے تسمیہ شرط ہے لیکن اہل کتاب کے بارے میں وہ شرط نہیں مانتے عمداً خدا کا نام لئے بغیر بھی وہ ذبح کریں تو ان کا ذبیحہ جائز ہے (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

امام مالک کا استدلال یہ ہے کہ غزوۂ خیبر میں ایک یہودی عورت نے گوشت سے رسول اللہ ﷺ کی ضیافت کی اور حضرت نے یہ دریافت کئے بغیر کہ جانور اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہے یا نہیں؟ اس گوشت کو تناول فرمالیا ہے تو گویا حضرت نے اہل کتاب کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے سے مستثنیٰ فرمادیا ہے۔ لیکن دوسرے ائمہ کے پاس یہ استدلال کمزور ہے۔ کیونکہ یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ عرب میں جو یہودی آباد تھے وہ اللہ کا نام لئے بغیر یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ اور حضرت نے اس علم کے باوجود ان کا ذبیحہ تناول فرمالیا ہے۔ جب یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یہود اللہ کا نام لئے بغیر ذبح کرتے تھے تو اس حدیث سے اس امر پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت نے اہل کتاب کا ذبیحہ تناول فرما کر ان کو تسمیہ سے مستثنیٰ فرمادیا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ اہل کتاب یہودی ہوں یا نصرانی ‘مشرک نہیں ہیں۔ انبیائے جلیل القدر کے امتی اور توریت وانجیل کے متبع تھے حضرت کو علم ہوگا کہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں۔ اس لئے دریافت نہیں فرمایا کہ اس ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔ پس حضرت کے اس عمل سے اہل کتاب کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے سے مستثنیٰ کرنا صحیح نہیں ہے۔

امام شافعیؒ کے پاس تو سرے سے تسمیہ کہنا شرط ہی نہیں ہے۔ نہ مسلمان کے لئے نہ اہل کتاب کے لئے یہ جس طرح مسلمان کا عمداً اللہ کا نام لئے بغیر ذبیحہ جائز ہے اسی طرح اہل کتاب کا ذبیحہ بھی ان کے پاس بغیر تسمیہ جائز ہے۔ البتہ اہل کتاب غیر اللہ کے نام پر ذبح کریں تو امام شافعیؒ کے پاس بھی حرام ہے۔ عدم تسمیہ پر امام شافعیؒ نے اس آیت سے استدلال فرمایا ہے۔

قل لا اجدفی مااوحی الّی محرماً علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة اودما مسفوحا اولحم خنزیر فانه رجس او فسقاً اهل لغیر الله به (سورہ انعام ۱۴۵)

یعنی ’’کہدو کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں جو مجھے پہنچی ہے کسی چیز کو حرام۔ کھانے والے پر جو اس کو کھاتا ہے مگر وہ چیز جو مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو۔ کیونکہ وہ ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے‘‘

اس آیت سے استدلال کر کے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ ذبح حرام نہیں ہوتا بلکہ صرف وہی ذبیحہ حرام ہے جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اور وہی فسق ہے۔ اس استدلال سے دوسرے فقہا کو اختلاف ہے۔ یہ ایک علمی اور غامض بحث ہے۔

امام شافعیؒ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ بعض لوگ مدینہ کے اطراف وجوانب میں رہتے ہیں وہ یہاں لاکر گوشت فروخت کرتے ہیں نہیں معلوم وہ وقتِ ذبح اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں کیا یہ گوشت کھایا جاسکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا۔

اذکروا سم اللہ علیھا انتم و کلوھا

یعنی ''تم خود اس پر اللہ کا نام لو اور کھالو''

یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے اکثر کتب صحاح ابوداؤد' نسائی' بخاری وغیرہ میں مروی ہے۔ اس حدیث سے امام شافعیؒ نے استدلال فرمایا ہے کہ وقت ذبح اللہ کا نام لینا مسلمان کے لئے بھی ضروری نہیں ہے لیکن دوسرے ائمہ کے پاس یہ استدلال بھی درست نہیں ہے۔ یہ صورت جیسا کہ امام مالکؒ نے موطا میں فرمایا ہے آغازِ اسلام میں پیش آئی ہے جب کہ مدینہ کے اعراب نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور اللہ کے نام سے ذبح کرنے کے عادی نہ تھے اور تمام اصحابِ رسول اللہ ﷺ کو علم تھا کہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا ضروری ہے اور اس کے حلال ہونے کی شرط ہے۔ اس بناء پر انہوں نے عرض کیا تھا کہ جو لوگ جدید الاسلام ہیں اور اپنے گاؤں میں جانور ذبح کر کے فروخت کرنے کے لئے مدینہ میں لاتے ہیں اس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں۔ اس گوشت کے بارے میں کیا حکم ہے۔ اگر بوقت ذبح تسمیہ شرط نہ ہوتا تو حضرت کا یہی جواب ہوتا کہ ذبیحہ حلال ہے۔ لیکن حضرت نے فرمایا کہ تم خود اللہ کا نام لیا کرو۔ یعنی جب مسلمان ذبح کرتا ہے تو اللہ کا نام ضرور لیا ہوگا تم کو تفحص اور جستجو کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم کو شک وتردد ہے تو تم خود اللہ کا نام لو اور کھالو۔ یہاں ایک ضابطہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ دیہات والے ناواقف مسلمان ذبح کریں تو تم کو تحقیق کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں۔ جب تک اس کے حرام ہونے کا قطعی ثبوت نہ ملے اس سے احتراز کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض حدیث عائشہؓ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تسمیہ واجب نہیں ہے۔ بلکہ منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے بارے میں حسن ظن رکھا جائے۔ فرضاً وتقدیراً

کوئی مسلمان اللہ کا نام نہ بھی لے تو اس کو سہو ونسیاں پر محمول کریں۔ یہی مذہب حضرت امام اعظمؒ کا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کوئی مسلمان ذبح کرتے وقت اللہ کا نام بھول جائے تو کیا ذبیحہ جائز ہے؟ فرمایا جائز ہے اللہ کا نام ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔

المسلم یذبح علی اسم اللہ سمی اولم یسم

یعنی ''مسلمان اللہ کے نام پر ہی ذبح کرتا ہے خواہ وہ اللہ کا نام لے یا نہ لے''

نصب الرایہ میں اس حدیث کی صحت پر کافی بحث کی گئی ہے۔ بشرط صحت یہ حدیث مسلمان سے خاص ہے اہل کتاب سے متعلق نہیں کی جاسکتی۔

غرض امام شافعیؒ کے پاس مسلمان اہل کتاب دونوں کے لئے بوقتِ ذبح تسمیہ شرط نہیں ہے عمداً بھی بسم اللہ نہ کہیں تو ذبیحہ جائز ہے (کتاب الفقہ علی المذہب الاربعہ)

امام مالکؒ کا مذہب گزر چکا کہ صرف اہل کتاب عمداً بھی تسمیہ ترک کریں تو ان کا ذبیحہ جائز ہے۔ (ایضاً)

امام احمد بن حنبلؒ کے پاس اہل کتاب کے لئے بوقتِ ذبح اللہ کا نام لینا ضروری ہے اگر عمداً ترک کریں تو ان کا ذبیحہ جائز نہیں ہے۔ اگر اس بات کا علم نہ ہو کہ انہوں نے اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں تو اس صورت میں جائز ہے (ایضاً)

حضرت امام اعظمؒ کے مذہب میں اہل کتاب کا ذبیحہ جائز ہے بشرطیکہ وہ غیر اللہ کا نام نہ لیں۔ اگر وہ اللہ کا نام نہ بھی لیں تو جس طرح ایک مسلمان سے حسنِ ظن رکھا جاتا ہے اسی طرح ان سے بھی حسنِ ظن رکھتے ہوئے ان کا ذبیحہ حلال سمجھا جائے گا۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ' فتاویٰ عالمگیریہ اور دوسری کتب فقہ حنفی میں امام اعظمؒ کا جو مذہب لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

''اہل کتاب کا ذبیحہ اس وقت جائز ہے کہ وہ یہودی یا نصرانی غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کریں مثلاً حضرت مسیح کا یا صلیاب کا یا حضرت عزیر کا نام نہ لے۔ ذبح کے وقت اگر کوئی مسلمان موجود ہے اور اس نے کتابی سے غیر خدا کا نام سنا ہے تو وہ ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ اگر مسلمان نے کچھ نہیں سنا تو اس کے بارے میں ایک مسلمان کی طرح حسن ظن رکھتے ہوئے وہ ذبیحہ جائز ہے۔ اگر وقتِ ذبح کوئی مسلمان

موجود نہیں ہے اور اس کے بارے میں کچھ سنا بھی نہیں گیا تو تب بھی وہ ذبیحہ جائز ہے''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل کتاب کا ذبیحہ جائز ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس کو ہمارے لئے حلال کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا ذبیحہ تناول فرمایا ہے اور ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک امام نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ دنیا کا کوئی مسلمان بھی اس کو ناجائز کہنے کی جراءت نہیں کرسکتا۔ عیسائی یا یہودی کے ہاتھ کا ذبیحہ مسلمان ضرور کھا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت یورپ وامریکہ میں طریقۂ ذبح کیا ہے اور وہاں کی ہوٹلوں میں جو گوشت ملتا ہے اس کے پخت وپز کا کیا انتظام ہے۔

یہ بحث گزر چکی ہے کہ جانور ہمارے قبضہ واختیار میں ہے تو اس کو لٹا کر اس طرح ذبح کریں کہ ان کی چاروں رگیں یعنی دونوں شہ رگ اور حلقوم ومری کٹ جائیں۔ اسکو ذبحِ اختیاری کہتے ہیں مانوس جانور کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے زخمی کر کے مارنا جائز نہیں ہے۔

آج کل یورپ میں جانوروں کو مشین سے ذبح کیا جاتا ہے یہ غیر شرعی طریقہ ہے۔ جانور کو کھڑا کر کے گردن پر مشین چلانے سے اول نخاع وحرام مغز کٹتے ہی جانور کے مرجانے کا احتمال ہے حالانکہ گردن کی رگیں کٹ کر خون کی روانی سے جانور کا مرنا ضروری ہے۔ اگر نخاع کٹتے ہی جانور مرجائے تو ذبیحہ قطعاً حرام ہے۔ اور اگر فرضاً گردن کی رگیں کٹنے کے بعد مرا ہے تو فقہا نے ذبیحہ کو مکروہ تحریمی لکھا ہے۔ ایک تو یورپ کا طریقہ ذبح غیر مشروع۔ دوسرے مُردار ہونے کا احتمال نہ بھی ہو تو طریقہ ذبح کی بنا پر ذبیحہ کا مکروہ تحریمی ہونا یقینی ہے۔ ایسی صورت میں مشین سے کٹے ہوئے جانور کا گوشت قریب بحرام ہوا اور پھر اللہ کا نام نہ لیا جانا اس پر مستزاد ہے۔ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے کی پابندی غالباً کچھ یہود کرتے ہیں لیکن عیسائی اللہ کا نام لینا تو کجا ان کے دل سے بھی اللہ کا خیال مسکہ میں سے بال کی طرح نکل چکا ہے۔ اس پر بھی بقول فقہا ان کے بارے میں حسن ظن بھی رکھا جائے کہ ان کے دل میں اللہ کا نام ہوگا تو یہ مشین سے کٹے ہوئے جانور کا شدید کراہت والا گوشت بھی وہاں کی ہوٹلوں میں ان برتنوں میں پکتا ہے جو سور کے گوشت سے ملوث اور شراب سے آلودہ ہوتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے لئے اس گوشت کو صاف وستھرے برتنوں میں پکانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا حالانکہ بالکل حلال وجائز اور غیر مشتبہ گوشت بھی ان برتنوں میں پکانا اور کھانا جائز نہیں ہے۔ امام ترمذیؒ اور امام بخاریؒ دونوں نے ابوثعلبہ خشنیؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم

مسلمان، اہل کتاب کے برتنوں میں کھانا پکا لیتے ہیں اور انہی میں پانی پی لیتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟ تو فرمایا کہ ان برتنوں کو دھو کر استعمال کر لیا کرو۔ یہ ترمذی کی روایت ہے۔ بخاری میں ہے کہ فرمایا ان برتنوں میں مت کھاؤ اگر مجبوری ہی ہے تو ان کو دھولو۔ گویا بخاری کی روایت میں اشدِ کراہت کا اظہار فرمایا ہے اگر چہ اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے۔ اور طریقہ ذبح کی وجہ سے مکروہ تحریمی بھی فرض کر لیا جائے تو چونکہ وہ شراب اور سور سے پرہیز نہیں کرتے اس لئے ان کے برتن ہمارے لئے ناپاک ہیں۔

ان حقائق کے باوجود بعض علمائے مصر وعراق نے فتویٰ دیا ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ جائز ہے۔ یہ فتویٰ اس حد تک صحیح ہے کہ اہل کتاب اپنے ہاتھ سے ذبح کریں اور ان کے برتنوں کو دھو کر یا ہم اپنے برتنوں میں پکا لیا کریں تو یہ حلال و جائز ہے۔ لیکن طریقہ ذبح اور وہاں کی ہوٹلوں میں پخت و پز کو سامنے رکھا جائے تو یہ مطلق فتویٰ ان علماء کے نظر ثانی کا محتاج ہے۔ کیونکہ مشین کا ذبیحہ مکروہ تحریمی ہے۔ دوسرے اہل کتاب، شراب اور سور سے پرہیز نہیں کرتے، ان کے برتن ناپاک ہیں۔

اس لئے احادیث مذکورہ کی روشنی میں جب تک جانور صحیح طریقہ سے ذبح نہ کیا جائے اور مسلمانوں کے برتن الگ نہ ہوں یورپ کی ہوٹلوں میں مسلمانوں کو گوشت کھانا جائز نہیں ہے۔ بعض مقامات پر جانور زبردست ہونے کی وجہ سے لٹایا نہیں جا سکتا اس لئے دوا سے یا بندوق کی گولی سے ضرب پہنچا کر بے ہوش یا کمزور کر دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن جانور کے مرنے سے پہلے اس کو ذبح کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس صورت میں مشین کے ذبیحہ کی طرح گوشت مکروہ بھی نہ ہوگا۔ البتہ وہاں کے برتنوں کی ناپاکی باقی رہے گی جس سے احتراز لازم ہے۔ فقط

☆☆☆☆☆

صدقۂ فطر

خدائے تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

قد افلح من تزکّٰی وذکر اسم ربہ فصلّٰی یعنی بیشک فلاحیت یافتہ وہ شخص ہے جس نے پاکی اختیار کی اور اپنے پروردگار کا نام دیا کیا اور پھر نماز پڑھی۔

اس آیت کریمہ کا ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی اس شخص کو حاصل ہوگی جو اپنے نفس کو سنوارا، کفر وشرک کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لایا، اپنے قلب وقالب کو ظاہری وباطنی نجاستوں سے پاک کر کے عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ سے آراستہ ہو کر اپنے پروردگار کا نام لیا اور نماز پڑھا۔

تزکّیٰ تزکیہ، زکواۃ سب کے معنی پاک ہونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ اسی لئے ذبح کرنے کو بھی زکواۃ کہا جاتا ہے کیونکہ ذبح کرنے سے جانور اس نجس خون سے پاک ہو جاتا ہے جو مضر صحت ہے اسی طرح اپنی ذاتوں کو گناہوں سے، ہوئ وہوس اور علائق نفسانیہ سے الگ تھلگ کر لینے کو تزکیۂ نفس کہتے ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے خدائے تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو بھی زکواۃ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا مال کو پاک کرنا ہے۔

چنانچہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے **خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم** یعنی محمدؐ! مسلمانوں کے مال میں سے آپ زکواۃ وصدقات لے کر ان کو پاک اور بابرکت کریں۔

مفسرین کو اختلاف ہے کہ اس آیت میں پاکی سے کیا چیز مراد ہے اور نماز سے کونسی نماز مقصود ہے۔ بعض کا قول ہے کہ پاکی حاصل کرنے سے والدین کے ساتھ حسن سلوک مراد ہے بعض کے پاس ترک غیبت، ترکِ محبت دنیا، ذکر کثیر، مصیبتوں پر صبر، تلاوت قرآن اور اخلاص وغیرہ مراد ہے۔ کسی نے تزکی سے یہی زکواۃ مفروضہ اور نماز سے نماز پنجگانہ مراد لی ہے۔

بعض مفسرین اور سلف صالحین کی ایک جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت صدقۂ فطر اور نمازِ عید کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ لفظ تزکّٰی زکواۃ سے ماخوذ ہے اور صدقۂ فطر زکواۃ کا حکم رکھتا ہے۔ پس تزکی سے صدقۂ فطر ''ذکر رب'' سے

تسبیح وتہلیل اور نماز سے نمازِ عیدالفطر مراد ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کا استدلال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ زکواۃ کا ذکر نماز کے بعد آیا ہے مثلاً'' اقیمو الصلوٰۃ و آتو الزکوٰۃ'' مگر خدائے تعالیٰ نے اس آیت میں زکواۃ کو نمازِ عید پر بلکہ ذکر پر بھی مقدم فرمایا ہے تو ضرور کوئی خاص صورت مراد ہے۔ جس میں یہ تینوں کام ترتیب سے واقع ہوں اور وہ صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اولاً صدقۂ فطر ادا کیا جائے' تکبیرات کہتے ہوئے عیدگاہ کو جائیں اور نماز عید پڑھی جائے''

آیت کی اس تفسیر پر شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ آیت مکۂ معظّمہ میں نازل ہوئی ہے اور صدقۂ فطر اور نمازِ عید کا وجوب مدینہ منورہ میں ہوا ہے۔ مکہ معظّمہ میں صدقۂ فطر دیا جاتا تھا نہ نماز عید پڑھی جاتی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ اگرچہ مکی ہے لیکن علم الٰہی میں مقدر تھا کہ صدقۂ فطر اور نماز عید پر عمل مدینہ میں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نزول آیت اور نفاذ حکم میں معاً لزوم نہیں ہے۔ جائز ہے کہ کوئی حکم یا پیشین گوئی پہلے صادر ہو جائے اور اس حکم پر عمل اور پیشین گوئی کا ظہور بعد میں ہو۔ مثلاً ایک دوسری آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے۔ **سیھزم الجمع ویولون الدبر** یعنی قریب میں ایک مجمع (مسلمانوں کے مقابلہ میں) شکست کھائے گا اور وہ (سب کفار) پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں حیران تھا کہ کون لوگ مسلمانوں کے مقابلہ میں پسپا ہوں گے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کے بعد غزوہ بدر میں جب بیشمار کفار ومشرکین کو چند مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر یہی آیت جاری تھی تب میں سمجھا کہ یہ آیت غزوۂ بدر سے متعلق ہے۔ اسی طرح خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

انت حل بھذا البلد محمدؐ آپ کے لئے اس شہر مکہ سے قید اٹھالی گئی یہ آیت بھی مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی مختلف تاویلوں میں سے ایک یہ ہے کہ مکہ میں کشت وخون حرام ہے لیکن فرماتا ہے کہ آپ کے لئے حلال جائز ہے۔ چنانچہ ہجرت کے سالہا سال کے بعد جب مکہ معظّمہ فتح ہوا تو ایک دن کے لئے حضرت کے لئے مکہ میں جنگ وجدال جائز کر دیا گیا اور حضرت نے خاص کعبۃ اللہ کے اندر بعض اشدا الکافرین کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔

اسی طرح آیت **قد افلح من تزکّٰی وذکر اسم ربہ فصلّٰی** اگرچہ مکی ہے لیکن تقدیر الٰہی یہی تھی کہ اس حکم کا نفاذ مدینہ منورہ میں ہوگا۔ چنانچہ ہجرت کے ڈیڑھ سال کے بعد ۲ ہجری

میں ۱۰ ار شعبان کو رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ اور آخر رمضان میں عید سے ایک یا دو دن قبل حضرت نے خطبہ دیا کہ ’’ خدائے تعالیٰ نے تم پر صدقہ فطر کو فرض کر دیا ہے دو آدمی ایک صاع گیہوں یا جو دے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام‘ چھوٹا ہو یا غلام‘‘ (فتح القدیر)

دار المختار میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رمضان کے ختم پر یہی خطبہ دیا کرتے تھے اور لکھا ہے کہ **ویجب وحدیث فرض رسول اللہ ؐ زکوٰۃ الفطر مناہ’’قدر‘‘ اوا جماع علی ان منکرھا لا یکفر** یعنی صدقہ فطر واجب ہے حدیث میں جو آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر کو فرض کر دیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ مقرر کر دیا ہے کیونکہ اس بات پر اجماع امت ہے کہ صدقہ فطر کا منکر کافر نہیں ہے۔

ظاہر حدیث کی بناء پر امام شافعیؒ سے ایک روایت صدقۂ فطر کی فرضیت کی بھی ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر مرد اور ہر عورت پر صدقۂ فطر کو واجب کر دیا ہے صدقۂ فطر کے واجب ہونے پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے امام شافعی کا بھی صحیح مذہب یہی ہے۔

غرض خدائے تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں فلاح و بہبودی کو دو باتوں پر موقوف کر دیا ہے ایک مالی عبادت‘ صدقہ فطر‘ اور دوسری بدنی عبادت‘ نماز عید پر امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے پاس ہر اس مسلمان پر صدقۂ فطر واجب ہے جس کے پاس عید کے دن کا قوت موجود ہو۔ مہدویہ اسی مذہب کو اختیار کرتے ہیں۔

امام اعظمؒ کے پاس مالک نصاب پر واجب ہے یعنی جس کے نزدیک اس کی حاجت اصلی کے علاوہ دوسو درہم چاندی ہو جو ۴۸ تولہ‘ ۷ ماشہ‘ ۲ رتی‘ ۲ جو کے مساوی ہے۔

چھوٹے بچوں کا صدقہ فطر بھی باپ پر واجب ہے۔ عاقل و بالغ اولاد کا صدقہ فطر باپ پر واجب نہیں ہے۔ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے پاس بیوی کا صدقۂ فطر شوہر پر واجب ہے۔ امام اعظمؒ کے پاس واجب نہیں ہے۔

اس کے وجوب کا وقت امام اعظمؒ کے پاس عید کے روز صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور ائمہ ثلثہ کے پاس عید کی رات ہی کو غروب آفتاب کے بعد ہی صدقہ فطر واجب ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عید کی شب میں صبح صادق سے پہلے مر جائے تو امام اعظمؒ کے

پاس وہ تارک واجب نہیں ہے۔ اور ائمہ ثلثہ کے پاس تارک واجب ہے۔ اس کے ورثاء اس کی طرف سے ادا کریں۔ اگر صدقہ فطر صبح صادق سے پہلے ادا کر دیا گیا تو امام اعظمؒ کے پاس جائز ہے بلکہ عید کے دن سے جتنے دن اور جتنے مہینے پہلے صدقہ فطر دیدیا جائے تو اس کا واجب ادا ہو جاتا ہے۔ البتہ امام شافعیؒ کے پاس رمضان سے قبل صدقۂ فطر دینا جائز نہیں ہے۔ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے پاس عید کے دن سے دو دن پہلے تک دینا جائز ہے

ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص صدقہ فطر ادا نہ کرے اور عید کا دن گزر جائے تو صدقۂ فطر اس کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس کا ادا کرنا عمر بھر واجب رہے گا۔

نماز عید بھی واجب ہے نماز عید کو جانے سے پہلے صدقہ فطر ادا کرنا مستحب ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز عید سے قبل اپنا صدقہ فطر ادا کرتے دوسروں کو ادا کرنے کا حکم دیتے۔ قد افلح من تزکّٰی وذکر اسم ربه فصلّٰی کی آیت تلاوت فرماتے اور نماز عید کو تشریف لے جاتے تھے۔ صحابہ کا بھی یہی عمل تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ اللہ اس شخص پر رحم کرے جس نے پہلے صدقہ فطر ادا کیا اور پھر نماز عید پڑھی۔ اور اسی آیت کی تلاوت فرماتے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی عادت تھی کہ عید الفطر کے روز دریافت فرماتے کہ میری طرف سے صدقہ فطر ادا کر دیا گیا ہے یا نہیں؟ اگر کہا جاتا کہ آپ کی طرف سے صدقہ فطر ادا کر دیا گیا ہے تو نماز عید کو تشریف لے جاتے اور اگر معلوم ہوتا کہ ابھی صدقۂ فطر نہیں دیا گیا ہے تو فرماتے کہ میرے نماز عید کو جانے سے پہلے ادا کر دو کیونکہ خدائے تعالیٰ اسی کے بارے میں فرمایا ہے قد افلح من تزکّٰی وذکر اسم ربه فصلّٰی حضرت عثمان غنیؓ ایک مرتبہ نماز عید سے قبل صدقہ فطر ادا نہ کر سکے اور آپ نے اس غلطی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عثمان! اگر تم سو غلام بھی آزاد کرو تو نماز سے قبل صدقۂ فطر ادا کرنے کا جو ثواب ملتا تھا وہ نہ ملے گا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا جس نے پہلے صدقہ فطر ادا کیا تکبیرات کہتے ہوئے عید گاہ کو گیا اور نماز عید پڑھی تو اس آیت کی بشارت کے موافق فلاحیت یافتہ ہوا۔

صدقۂ فطر کے واجب ہونے کی غرض وغایت ایک حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ

زکوۃ الفطر طهرة للصائم من اللغو والرفث وطمعة للمساكين

اس فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ ’’صدقۂ فطر اس لئے واجب کیا گیا ہے کہ روزہ دار سے روزہ میں آداب روزہ کے خلاف جو فتور واقع ہوتا ہے اور روزہ رکھنے کے باوجود جو لغویات اور لغزشیں صادر ہوتی ہیں صدقۂ فطر سے اس کی تلافی ہوجاتی ہے اور روزہ دار ان گناہوں سے پاک ہوجاتا ہے۔ دوسری غرض اس کے وجوب کی یہ فرمائی کہ غرباء ومساکین کو اس کے ذریعہ امداد پہنچے اور عید کے دن ان کو بھی کچھ کھانے کو مل جائے‘‘

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا **اغنوھم فی ھذا لیوم عن المسئلۃ** یعنی عید کے دن غرباء ومساکین کو سوال کرنے سے مستغنی کردو یعنی وہ بھی عید کرنے سے محروم نہ رہیں ان کو سوال کرنے کی ضرورت نہ پڑے‘‘

وکیع بن جراح (شاگرد امام اعظمؒ استاد امام شافعیؒ) اور حسن بصریؒ کا قول ہے کہ صدقہ فطر اور روزہ میں وہی تعلق ہے جو نماز اور سجدۂ سہو میں ہے یعنی نماز میں کوئی غلطی ہوجائے تو جس طرح سجدۂ سہو سے اس کی تلافی ہوجاتی ہے اسی طرح حالت روزہ میں روزہ دار سے جو گناہ صادر ہوتے ہیں مثلاً جھوٹ، چوری، غیبت، چغلی وغیرہ ان سب گناہوں سے روزہ دار کو پاک کرنے والا صرف صدقہ فطر ہے۔

یہی نہیں کہ صدقہ فطر ہمارے چھوٹے چھوٹے گناہوں کا کفارہ بن جاتا اور اس سے فقراء ومساکین کی بھی عید ہوجاتی ہے بلکہ روزہ داروں کا خدائے تعالیٰ کے پاس مقبول ہونا صرف صدقہ فطر کی ادائی پر موقوف ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا **صوم رمضان معلق بین السماء والارض لا یرفع الا بزاکوۃ الفطر** یعنی رمضان کا روزہ زمین وآسمان کے درمیان معلق رہتا ہے صدقۂ فطر کی ادائی کے بغیر درگاہ الٰہی میں بار نہیں پاتا۔

ایک حدیث میں ہے کہ اگر صدقہ فطر ادا کیا گیا تو خدائے تعالیٰ اس روزہ کو جو زمین وآسمان میں معلق ہے دو سبز پر لگا دیتا ہے۔ جن سے پرواز کرکے وہ آسمان ہفتم پر پہنچتا ہے اور خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ دار کے آنے تک اس روزہ کو عرش کی قندیلوں میں سے ایک قندیل میں رکھ دو۔ غرض رسول اللہ ﷺ نے ہر مرد اور عورت پر صدقہ فطر واجب فرمادیا ہے۔ خواہ وہ روزہ رکھے یا نہ رکھے۔ ہر شخص اپنی طرف سے اپنے چھوٹے بچوں کی طرف سے اپنے عاقل وبالغ

بچوں کی طرف سے جو مجنوں ہیں اور اپنے کل متعلقین کی طرف سے جن کا نفقہ اس پر واجب ہے صدقہ فطر ادا کرے۔

صدقہ فطر کے بارے میں کہ کونسی چیز کتنی دی جائے ''ہدایہ'' میں لکھا ہے۔

'' **الفطرة نصف صاع من براد دقيق او سويق او زبيب وصاع كامل من تمر او شعير** یعنی گیہوں' گیہوں کا آٹا' ستّو اور کشمش ہوں تو فطرۃ نصف صاع کا ہوتا ہے اور اگر کھجور یا جوَ فطرۃ میں دیئے جائیں تو پورا ایک صاع دینا چاہئے۔''

امام اعظمؒ کے پاس ان اشیائے مذکورہ کے علاوہ دوسری کوئی جنس دینا ہو تو باندازۂ قیمت دینا جائز ہے۔ فتاوی عالمگیریہ میں لکھا ہے۔

وما سواء من الحبوب لا يجوز الا بالقيمت یعنی ان منصوص علیہ اشیاء کے سوا کوئی دوسری چیز اسی مقدار میں دینا جائز نہیں ہے بلکہ شئی منصوص علیہ کی قیمت کا اندازہ کر کے اس قیمت کے موافق دینا چاہیئے۔''

فرض کیجئے گیہوں کا فطرہ نصف صاع ہے تو کوئی اور غیر منصوص جنس کا نصف حصہ دینا جائز نہیں ہے۔ بلکہ نصف صاع گیہوں کی قیمت میں وہ جنس جس مقدار میں آ سکتی ہے اسی قدر دینا چاہئے مثلاً ہمارے پاس جواری ہے اور ہم وہی فطرۃ میں دینا چاہتے ہیں تو اگر نصف صاع گیہوں کی قیمت دو روپئے ہے تو دو روپئے میں جتنی جواری آ سکتی ہے اسی قدر دینا ضروری ہے۔

امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے پاس اشیائے منصوصہ گیہوں' آٹا' ستّو' کشمش' کھجور اور جو میں ہر چیز کا فطرہ ایک صاع ہے۔ ان ائمہ کے پاس ان مذکورہ اشیاء کی قیمت بھی دینا جائز نہیں ہے۔ البتہ امام شافعیؒ کے پاس ان اشیاء کے علاوہ ہر وہ چیز فطرۃ میں دی جاسکتی ہے جو زمین سے اُگتی ہے اور جس میں عشر واجب ہے اور امام احمدؒ کے پاس صرف وہ چیز فطرہ میں دینا جائز ہے جس میں غذائیت ہے۔

لیکن حضرت امام اعظمؒ کے پاس ان اشیاء کے بجائے اور ان اشیائے مذکورہ منصوصہ کے عوض ان کی قیمت بھی صدقۂ فطر میں دی جائے تو جائز ہے فقہا لکھتے ہیں۔

هذا الفح للفقراء مطلب یہ ہے کہ بہ نسبت ان اجناس کے ان کی قیمت ادا کرنے

میں فقراء ومساکین کے کئی کام نکل سکتے ہیں اس لئے امام اعظمؒ کے پاس ان کی قیمت فطرۃ میں دی جائے تو نہ صرف جائز بلکہ افضل ہے۔مہدویہ کا عمل امام اعظمؒ کے مذہب پر ہے۔

یہ بات بھی یادرکھی جائے کہ بالاتفاق ائمہ اربعہ کے فقہائے متاخرین کا فتویٰ یہ ہے کہ زکواۃ' صدقۂ فطرۃ' اور کفارات غرض تمام صدقات سادات کو دیئے جاسکتے ہیں۔مہدویہ کا عمل اسی پر ہے۔

وزنِ صاع کے بارے میں دار المختار میں لکھا ہے۔ **الصاع المعتبر یسع الفاً واربعین در هماًمن ماس او عدس** یعنی صاع جوفقہائے حنفیہ کے پاس معتبر ہے وہ ایک ایسا ظرف یا پیمانہ ہے جس میں ایک ہزار چالیس (۱۰۴۰) درہم کے وزن کے ماس یا مسور کی دال سما سکے'' اور درہم شرعی کی تعریف یہ کی ہے کہ **الدرهم اربعة عشر قیراطا والقیراط خمس شعیرات فیکون الدرهم الشرعی سبعون شعیرة** یعنی درہم ۱۴ قیراط کا اور قیراط ۵ دانہ جو کا ہوتا ہے پس ایک درہم (۷۰) دانۂ جو کے مساوی ہے۔

اس طریقہ کو اس طرح بھی واضح کیا جاسکتا ہے۔۵ دانہ جو کا ایک قیراط ۱۴ قیراط کا ایک درہم (۱۰۴۰) درہم کا ایک صاع۔گویا ایک صاع کا وزن بہتر ہزار آٹھ سو (۷۲۸۰۰) دانۂ جو کے مساوی ہوا۔

فتاوی عالمگیریہ میں لکھا ہے۔ **الصاع ثمانیة ارطال بالبغدادی والرطل البغدادی عشرون استارا والاستار اربعة مشاقیل ونصف مثقال** یعنی آٹھ رطل بغدادی کا ایک صاع ہوتا ہے۔ایک رطل بیس استار کا ایک استار ساڑھے چار مثقال کا ہوتا ہے۔ مثقال کے بارے میں لکھا ہے والمثقال ھوالدینار عشرون قیراط یعنی مثقال اور دینار ایک ہی چیز ہے جو بیس قیراط کا ہوتا ہے۔

اس کو اس طرح بھی ترتیب دے سکتے ہیں۔۵ دانہ جو کا ایک قیراط۔۲۰ قیراط کا ایک مثقال۔ساڑھے چار مثقال کا ایک استار۔۲۰' استار کا ایک رطل۔۸ رطل کا ایک صاع

اس کا حاصل یہ ہوا کہ سو دانۂ جو کا ایک مثقال اور (۴۷۰) مثقال کا ایک صاع ہے۔ اس لحاظ سے (۲۰۰۰) دانۂ جو ایک صاع کا وزن ہے۔

گویا عرب میں صاع' درہم و دینار دونوں اوزان سے بنایا جاتا ہے اور دونوں میں تین

تولہ سے زیادہ فرق نہیں ہے۔ صاحب در المختار نے درہم والے وزن کو معتبر لکھا ہے یعنی (۲۸۰۰ ۷) دانہ جوایک صاع کا وزن ہے ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

صاع کا پیمانہ عرب' عراقِ عرب' شام ومصر اور ممالک اسلامیہ میں رائج ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں صاع' اوقیہ' درہم ومثقال رائج نہیں ہے اس لئے ان عربی اوزان کو ہمارے مروجہ اوزان رتی' ماشہ' تولہ اور سیر میں منتقل کرنا ناگزیر ہے۔ رتی کا مختلف وزن رائج ہے۔ بعض لوگ ۲ جو کا بعض ۳ جو کی اور بعض ۴ جو کی ایک رتی قرار دیتے ہیں۔ ۸ رتی کا ایک ماشہ' ۱۲ ماشہ کا ایک تولہ اور ۸۰ تولہ کا ایک سیر ہوتا ہے۔ حالیہ وزن کیلو ۷ ۸ تولہ کے اور دس گرام ۱۱ ماشہ کے مساوی ہے۔

(۱) اگر دو جو کی ایک رتی قرار دی جائے تو (۲۸۰۰ ۷) جو کے ۳۷۹ تولہ' ۲ ماشہ ہوتے ہیں۔ جس کا نصف ۱۸۹ تولہ' ۷ ماشہ یعنی ۲ سیر' ۲۹ تولہ ۷ ۷ ماشہ ایک فطرہ کا وزن ہے۔

(۲) اگر ۳ جو کی ایک رتی قرار دی جائے تو (۲۸۰۰ ۷) جو کے ۲۵۲ تولہ' ۹ ماشہ' ۲ رتی' ۲ جو ہوئے۔ بہ غرض سہولت کسرات پورے کر لئے جائیں تو ۲۵۳ تولہ کا ایک صاع ہوا۔ اس کا نصف ۱۲۶ تولہ' ۶ ماشہ یا ایک سیر ۴ ۶ تولہ' ۶ ماشہ ایک فطرہ کا وزن ہے۔

(۳) اگر ۴ جو کی ایک رتی قرار دی جائے تو (۲۸۰۰ ۷) دانہ جو کے ۱۸۹ تولہ' ۷ ماشہ ہوتے ہیں اس کا نصف ۹۴ تولہ' ۹ ماشہ' ۴ رتی ہے جو ایک فطرہ کا وزن ہوگا۔ اس کے ایک سیر ۱۴ تولہ' ۹ ماشہ' ۴ رتی اور وزن رائج الوقت کے لحاظ سے ایک کیلو (۱۰۷) گرام ہوتے ہیں۔

صاع کے ان مذکورہ تینوں اوزان کے منجملہ دوسرا وزن جو نمبر (۲) میں بیان کیا گیا ہے اور جو فی رتی ۳ جو کے حساب سے بنایا جاتا ہے پہلے اور تیسرے وزن یعنی فی رتی ۲ جو اور ۴ جو کا درمیانی' متوسط اور معتدل وزن ہے۔ ہماری قوم میں اسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے پاس اوقیہ کے وزن کو متعین کرنے میں بھی ۳ جو کی ایک رتی قرار دی جاتی ہے۔ یعنی ۵ دانہ جو کا ایک قیراط ۔ ۱۴ قیراط کا ایک درہم۔ چالیس درہم کا ایک اوقیہ۔ گویا ستر دانۂ جو کا ایک درہم ہوا۔ بحساب فی رتی ۳ جو' ایک درہم ۲ ماشہ' ۷ رتی' ایک جو کے مساوی ہے۔ اسکو چالیس سے ضرب دیں تو ۹ تولہ' ۸ ماشہ' ۵ رتی' ۱ جو۔ ایک اوقیہ کا وزن ہوا جو ہماری قوم میں رائج ہے۔ اوقیہ کا ذکر تو ضمناً آ گیا جو یقیناً فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ غرض یہ ہے کہ قدیم الایام سے ہمارے پاس ایک رتی مساوی ۳ جو

کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اور اسی کو اوسط الاوزان کہا جاسکتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ عرب میں دس درہم کے وزن میں اختلاف تھا۔ بعض لوگ دس درہم پانچ مثقال کے اور بعض چھ مثقال کے اور بعض دس درہم دس مثقال کے مساوی قرار دیتے تھے۔ اس اختلاف کی وجہ سے اکثر اوقات کاروبار ،خرید وفروخت اور لین دین میں نزاع پیدا ہوجاتی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں اس اختلاف کو پیش کر کے رفعِ نزاع کی درخواست کی گئی۔ حضرت نے تینوں اوزان کا اوسط نکالا اور پھر ۲۱ کو تین پر تقسیم فرمایا تو خارج قسمت ۷ ہوئے۔ فرمایا کہ دس درہم ۷ مثقال کے مساوی قرار دیئے جائیں۔

اسی طرح ۲ یا ۳ یا ۴ جو کی رتی بنائی جاتی ہے۔ اس اختلاف کو رفع کرنے کی باتباع حضرت فاروق اعظمؓ تینوں اوزان ۲، ۳، ۴ کو جمع کیا جائے تو ۹ ہوئے۔ اس کو تین پر تقسیم کرنے سے خارج قسمت ۳ حاصل ہوئے۔ پس ہم نے تین جو کی ایک رتی قرار دی جو پہلے سے رائج بھی ہے۔

اس تمام تفصیل کا خلاصہ اور حاصل مطلب یہ ہے کہ ایک صاع کا شرعی وزن (۷۲۸۰۰) دانہ جو کے مساوی ہے۔ بحساب فی رتی ۳ جو (۲۵۳) تولہ کا ایک صاع ہوا۔ اور اس کا نصف ۱۲۶ تولہ ۶ ماشہ فطرۂ گندم کا وزن ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیر کا رواج متروک اور کیلوگرام کا وزن رائج ہے۔ اور ایک کیلوگرام (۸۷) تولہ کا ہوتا ہے اس لئے ڈیڑھ کیلوگرام گیہوں جس کے (۱۳۰) تولہ ۶ ماشہ ہوتے ہیں فطرہ میں دیئے جائیں تو ۴ تولہ فاضل ہی رہتے ہیں۔ یہی وزن فطرہ اولیٰ وانسب ہے۔ واللہ اعلم فقط

☆☆☆☆☆

نصاب کا معیار سونا یا چاندی ہی کیوں

۳۰ رنومبر ۱۹۷۶ء کے روزنامہ سیاست میں عنوان مذکور الصدر کے تحت جناب ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی جامعۂ عثمانیہ کا ایک نوٹ شائع ہوا ہے جس کو ہم بجنسہ نقل کرتے ہیں۔

''چند سال پہلے استاد محترم مولانا حسام الدین صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولوی جلال الدین صاحب حسامی نے اخبار میں ایک استفسار اور استفتاء شائع کیا تھا کہ عام طور پر صاحبِ نصاب وہ آدمی ہے جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا' یا ساڑھے باون تولے چاندی ہو۔ ایسے ہی آدمی پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے یا قربانی واجب ہوتی ہے۔ آج ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت بازار میں بہت زیادہ ہے۔ اور ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت اس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ پھر دونوں پر یکساں ذمہ داری کیسے ہے؟ اسلام عدل وانصاف کا مذہب ہے پھر اس کے احکام میں یہ عدم مساوات کیسے ہوسکتی ہے۔ اس کا کوئی معقول جواب کسی عالم یا فقیہہ نے ہنوز نہیں دیا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ یہ سوال بہت معقول نظر آتا ہے۔ اس کی تحقیق ہونی چاہئے۔ میرے مخلص اور عالم رفیق مولانا احمد حسین خاں صاحب مولوی فاضل ایم اے سابق پروفیسر عربی عثمانیہ یونیورسٹی آرٹس کالج اور میں نے کتابوں کی چھان بین شروع کی۔ مولانا امیر علی مرحوم محقق ومجتہد فقیہہ کی شرح ہدایہ میں یہ نکتہ ملا کہ اس زمانہ میں ساڑھے سات تولے سونے اور ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت بازار میں ایک ساتھ ہی تھی۔ اسی لئے دونوں قسم کے صاحبانِ نصاب پر یکساں ذمہ داری عائد ہوئی۔ مولانا احمد حسین خاں صاحب نے فرمایا کہ آج دونوں کی قیمتوں میں اتنا بڑا فرق ہوگیا ہے کہ بیچارے چاندی کے نصاب والے غریب کے لئے یہ مشکل ہے۔

مختلف معاشی انقلابات کے باعث سونا معیارِ زر بنتا گیا اور چاندی کی قیمت اس تناسب سے بڑھتی نہ گئی۔ امریکہ میں پریسیڈنٹ جمی کارٹر کے انتخاب کے بعد اخباروں میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ دنیا کے بعض علاقوں میں سونے کی قیمت کچھ اور بڑھ گئی۔ یہ گفتگو جاری تھی کہ بین الاقوامی شہرت کے عالم باعمل مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء بھی حسن اتفاق سے حیدرآباد تشریف لائے۔ انہوں نے بھی اتفاق ظاہر فرمایا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ان دونوں دھاتوں کی قیمت اسی

تناسب سے ایک سی تھی۔ مسئلہ بہر حال زیر غور رہا اور آج تک اس کا حل مجتہد علماء کی طرف سے پیش نہیں کیا گیا۔ جب قربانی کا زمانہ آتا ہے تو اس مسئلہ کے حل کی ضرورت خاص طور پر محسوس ہوتی ہے۔ امید ہے کہ ہمارے اخبار اس نوٹ کو شائع فرما کر سب مسلمانوں کی مدد فرمائیں گے۔ نامناسب بے توجہی اور تاخیر ایسے ضروری مسائل کے حل کے لئے مناسب نہیں ہوتی''

اس اپیل کا کہیں سے کوئی جواب ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ حالانکہ جس طرح جناب ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے یہ ایسا اہم مسئلہ ہے کہ ہر سال قربانی کے موقع پر ہر مسلمان کو اس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ علمائے کرام کی طرف سے اس کا تشفی بخش جواب ملنا بہت ضروری تھا۔ لیکن ۳۰ر نومبر کے بعد سے اس وقت تک اس کا کوئی حل کسی نے پیش نہیں کیا۔ ہم نے حضرت افضل العلماء مولانا سید نجم الدین صاحب مدفیوضہم صدر مجلس علمائے مہدویہ ہند سے گزارش کی کہ وہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں کہ درحقیقت قربانی کا نصاب کیا ہے۔ اور جناب ڈاکٹر صاحب کے بیان کے موافق اس مسئلہ میں جو اشتباہ پیدا ہو رہا ہے اس کا جواب کیا ہوسکتا ہے۔ ہم کو مسرت ہے کہ ہماری درخواست پزیرائی ہوئی۔ اور حضرت افضل العلماء مدظلہم نے اس مسئلہ کو نہایت واضح طور پر حل فرمایا ہے۔ یہ مختصر' مفید اور بصیرت افروز مضمون جس میں اصل مسئلہ کے علاوہ زکوٰۃ وقربانی کے ضروری مسائل بھی آ گئے ہیں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے (مدیر نور حیات)

شریعت اسلامیہ میں مقادیر زکوٰۃ اور قربانی وصدقۂ فطر کا نصاب منصوص ہے۔ اس میں کسی وقت بھی ردوبدل کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی مسلمان کے پاس بیس دینار یعنی ساڑھے سات تولے سونا یا دوسو درہم یعنی ساڑھے باون تولے چاندی ہے تو' بیس دینار کا چالیسواں حصہ یعنی نصف دینار' اور دوسو درہم کا چالیسواں حصہ یعنی پانچ درہم' زکوٰۃ میں دینا فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص پر اس کی حیثیت کے موافق ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ کیونکہ ایک شخص کے پاس بیس دینار سونا ہے وہ سونے میں سے نصف دینار۔ اور ایک کے پاس دوسو درہم چاندی ہے وہ چاندی میں سے پانچ درہم دے رہا ہے۔ پس زکوٰۃ کی حد تک عدم مساوات اور عدل وانصاف سے انحراف کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں ہر ایک پر ذمہ داری یکساں ہے۔ قربانی کا نصاب دوسو درہم چاندی ہے۔ اور چاندی کی زکوٰۃ کا بھی یہی نصاب ہے۔ مگر مطلقاً یہ بات مشہور ہے کہ جس پر زکوٰۃ فرض ہے اس پر قربانی واجب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا

کہ جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا ہے اس پر بھی قربانی واجب ہے۔ اور اگر کسی کے پاس ساڑھے باون تولے چاندی ہے تو اس پر بھی قربانی واجب ہے۔ حالانکہ آج سونے اور چاندی کے نرخ میں بہت زیادہ فرق ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان دونوں صاحبانِ نصاب پر یکساں ذمہ داری کیسے عائد ہوسکتی ہے۔ یقیناً یہ عدل وانصاف سے تجاوز ہے۔ اس کا جواب وہی ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ساڑھے سات تولے سونا اور ساڑھے باون تولے چاندی قیمت میں مساوی تھے۔ لیکن نرخ کا یہ تناسب آج باقی نہیں رہا اس لئے موجودہ حالات میں دونوں نصابوں کو مساوی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

قربانی کا اصل نصاب فقہ حنفی کی رو سے دو سو درہم چاندی ہے۔ جس شخص کے پاس مکان، لباس اور ضروری سامان کے علاوہ دوسو درہم یعنی ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کے مساوی کوئی چیز ہے تو اس پر قربانی واجب ہے۔

صاحب ہدایہ نے کتاب الاضحیہ میں قربانی کے وجوب کے بارے میں فرمایا۔

ومقداره ما يجب به صدقة الفطر

یعنی ''جس نصاب سے صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے اُسی نصاب سے قربانی واجب ہے''

اور ظاہر ہے کہ صدقہ فطر کا نصاب ساڑھے سات تولے سونا نہیں ہے۔ درالمختار میں لکھا ہے۔

وشرائطها الاسلام والاقامة واليسار الذى يتعلق به وجوب صدقة الفطر (کتاب الاضحیہ)

یعنی'' قربانی واجب ہونے کی شرط اسلام، اقامت اور اس قدر مال داری ہے جس سے صدقہ فطر واجب ہوتا ہے''

اور پھر صدقۂ فطر کے تحت لکھا ہے۔

وبهذا النصاب تحرم الصدقة كما مر وتجب الاضحيه ونفقة المحارم

یعنی'' صدقۂ فطر کے اسی نصاب سے قربانی اور نفقۂ محارم (قرابت داروں کو نفقہ دینا) واجب ہے۔ اور جس کے پاس اس قدر نصاب ہے وہ مالدار وغنی ہے اس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ یہ نصاب (دو سو درہم) تین چیزوں سے متعلق ہے۔ ایک حرمتِ

صدقۂ دوسری وجوبِ فطرۂ تیسری وجوبِ قربانی۔ چنانچہ ہدایہ میں لکھا ہے۔

ویتعلق بهذا النصاب حرمان الصدقة ووجوب الاضحية والفطر

یعنی ''اس نصاب سے قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہے۔اس نصاب والے کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے''

فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے۔

اما شرائط الوجوب منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقةالفطر دون ما متعلق به وجوب الزكوٰة (کتاب الاضحیہ)

یعنی ''قربانی واجب ہونے کی ایک شرط توانگری بھی ہے۔جس توانگری سے صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے اسی توانگری سے قربانی واجب ہے۔لیکن وجوب زکوٰۃ کی جو شرطیں ہیں وہ قربانی سے متعلق نہیں ہیں''

صاحب درالمختار نے اور اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین نے ردالمختار میں کتاب باب المصرف میں لکھا ہے کہ جس کے پاس دوسو درہم ہیں وہ مالدار ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صدقۂ فطر کا جو نصاب ہے قربانی کا بھی وہی نصاب ہے۔یعنی دوسو درہم اور یہی زکوٰۃ کا بھی نصاب ہے۔لیکن وجوب زکوٰۃ کے جو شرائط ہیں وہ قربانی سے متعلق نہیں ہیں۔مثلاً حولانِ حول یعنی ایک سال مال پر سے گزرنا' اور مال میں نما یعنی زیادتی ہوتے رہنا' زکوٰۃ میں شرط ہے۔لیکن قربانی میں ''حولانِ حول'' اور ''نما'' شرط نہیں ہے۔اگر قربانی کے روز بھی کوئی شخص صاحب نصاب ہوگیا ہے تو اس پر قربانی واجب ہے۔کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں قربانی کے نصاب کو بالکل منقح کردیا ہے۔چنانچہ لکھا ہے۔

الحنفيةقالوا القادر عليها هوا لذى يملک مائتى درهم وقد تقدم بيانها فى الزكوٰة اويملک عرضا يساؤى مائتى درهم يزيد عن مسكنة وثياب اللبس والمتاع الذى يحتاجه

یعنی ''حنیفہ کے پاس قربانی اس شخص پر واجب ہے جو قربانی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔یعنی اس کے پاس دوسو درہم چاندی ہو یا رہنے کے مکان' پہننے کے کپڑوں اور ضروری سامان کے علاوہ اس قدر مالیت کی اشیاء ہوں جن کی قیمت دوسو درہم چاندی کی قیمت کے مساوی ہے''

یہاں تک تو مسئلہ بالکل صاف ہے کہ صدقۂ فطر کا جو نصاب ہے وہی قربانی کا نصاب ہے۔

یعنی دوسو درہم چاندی۔لیکن میرے ناقص خیال میں قربانی کے مسئلہ میں اشتباہ یا غلط فہمی فتاویٰ عالمگیریہ کے اس قول سے پیدا ہوئی ہے۔

والموسر فی ظاھر الروایۃ من لہ ما ئتادر ھم او عشرون دینارا

یعنی'' قربانی مالدار پر واجب ہے اور مالدار یا تو انگر ظاہر روایت میں وہ شخص ہے جس کے پاس دوسو درہم چاندی یا بیس دینار سونا ہے۔

ظاہر روایت سے مراد کتب امام محمدؒ ہیں جن میں فقہ حنفی کے مستند ترین احکام ومسائل درج ہیں۔معلوم ہوتا کہ کہ حضرت امام محمدؒ المتوفی ۱۸۹ھ کے زمانہ تک بھی دوسو درہم چاندی اور بیس دینار سونا قیمت میں مساوی تھے۔اس لئے یہ کہنے میں کوئی حرج نہ تھا کہ جس کے پاس بیس دینار یعنی ساڑھے سات تولے سونا ہے اس پر بھی قربانی واجب ہے۔اور جس کے پاس دوسو درہم یعنی ساڑھے باون تولے چاندی ہے اس پر بھی قربانی واجب ہے۔لیکن یہ مساوات اتفاقی تھی۔شرعی مساوات نہ تھی کہ اس میں تبدیلی نہ ہوسکتی۔ یہ بازار کا نرخ تھا جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔اور یہی ہوا کہ یہ مساوات باقی نہیں رہی اور قربانی کا نصاب دوسو درہم ہی برقرار رہا۔اور امام محمدؒ کے بعد فقہائے حنفیہ نے بیس دینار کا ذکر ہی نہیں کیا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب دوسو درہم چاندی رکھنے والے پر قربانی واجب ہے تو جس کے پاس بیس دینار یعنی ساڑھے سات تولے سونا ہے تو اس پر بدرجۂ اولیٰ قربانی واجب ہوگی۔ بلکہ تھوڑا بہت جس قدر بھی سونا ہے اگر اس کی قیمت دوسو درہم چاندی کی قیمت کو پہنچ جائے تو اس پر بھی قربانی ضرور واجب ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ قربانی مالدار پر واجب ہے۔اور شریعت میں مالدار کس کو کہتے ہیں۔ خود امام محمدؒ نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا ہے کہ شرعی اصطلاح میں مالدار وہی ہے جس کے پاس دوسو درہم ہیں۔چنانچہ جامع الصغیر میں فرمایا۔

لا یحل الزکوٰۃ لمن لہ مائتا درھم ولا بائس لمن لہ اقل من مائتی درھم.

یعنی'' جس کے پاس دوسو درہم ہیں اس کو زکوٰۃ نہ دی جائے۔اور جس کے پاس دوسو درہم سے کم ہیں اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دوسو درہم والا مالدار ہے۔صدقہ لینے کا مستحق نہیں ہے اور جس کے پاس

دوسو درہم سے کم ہیں وہ فقیر ہے اس کو صدقہ دیا جاسکتا ہے۔

صدر شہید المتوفی ۵۳۶ھ جو کبار فقہائے حنفیہ سے ہیں اور صاحب ہدایہ کے استاد ہیں جامع الصغیر کی شرح میں لکھتے ہیں۔

لان الغناء الشرعی مقدر به االا ان االنماء شرط لوجوب الزکوٰة . تیسیر ا ولیں بشرط لجریا نها حتی لو ملک مالا تبلغ قیمته مائتی در هم وهو فاضل عن حاجته الا صلیةغیر معدللتجارةلا تجب علیه الزکوٰةوحرمت علیه الصدقة ووجبت علیه الفطر والاضحیة.

یعنی ''کسی کے پاس دوسو درہم ہیں تو وہ شرعاً غنی یعنی مالدار ہے۔مگر اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے مال بڑھتے رہنے کی شرط ہے۔ چنانچہ کسی کے پاس اس قدر مال ہے کہ اس کی قیمت دوسو درہم کو پہنچ گئی ہے اور وہ مال اس کی ضرورت سے زیادہ بھی ہے اگر اس مال سے تجارت نہیں کی جارہی ہے تو ایسے شخص پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے مگر چونکہ وہ غنی ہے اس کو صدقہ نہیں دیا جاسکتا۔اس پر صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہے''

پس حنفیہ کے پاس نصاب کا معیار چاندی ہے جس کے پاس دوسو درہم یعنی ساڑھے باون تولے چاندی ہے یا اس کے روزمرہ کے ضروری اشیاء کے علاوہ اس قدر مال ہے کہ اس کی قیمت دوسو درہم کے مساوی ہے تو اس پر قربانی واجب ہے۔قربانی کے مشروع ہونے میں امت میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔البتہ اس کے حکم میں اختلاف ہے۔حضرت امام اعظمؒ ابوحنیفہؒ کے پاس قربانی واجب ہے۔نصاب یعنی دوسو درہم کی موجودگی کے بعد قربانی نہ کرے تو وہ تارکِ واجب ہے۔ترکِ واجب سے آدمی گنہگار ہوتا ہے۔اس سے باز پرس اور مواخذہ ہوگا۔امام اعظمؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے پاس قربانی سنت ہے۔لیکن فتویٰ امام اعظمؒ کے قول پر ہے۔

ائمہ ثلاثہ میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے پاس قربانی سنت موکدہ اور امام احمدؒ کے پاس سنت ہے۔قربانی کرنے والا عنداللہ ماجور ومثاب ہے اور تارک سے مواخذہ نہ ہوگا۔امام مالکؒ سے ایک روایت وجوب کی بھی ہے۔

ائمہ ثلاثہ میں سے کسی امام کے پاس بھی قربانی کا کوئی نصاب نہیں ہے یعنی دوسو درہم کی

ملکیت قربانی کے لئے ضروری نہیں ہے۔

امام مالکؒ کے مذہب میں قربانی کا جانور خریدنے کے بعد اگر اس کا کوئی ضروری کام رک نہیں جاتا تو اس کو قربانی کرنا چاہئے۔ اگر قرض ادا کرنے کی استطاعت ہے تو قرض لے کر قربانی کرے۔

امام شافعیؒ کے پاس اس کی اور اس کے اہل وعیال کی ضرورت پوری ہونے کے بعد جانور کی قیمت نکل سکتی ہے تو کافی ہے۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ قرض لے کر بھی قربانی کی جائے بشرطیکہ وہ قرض ادا کرسکتا ہے۔

حنفیہ کے مذہب کے موافق نصاب کی بحث گزر چکی۔ البتہ ایک ضروری بات یہ ہے کہ بیس دینار کو ساڑھے سات تولے اور دوسو درہم کو ساڑھے باون تولے کے مساوی قرار دینا بھی تحقیق طلب ہے۔ صاحب غایۃ الاوطار کے بیان میں اضطراب ہے۔ کتاب الزکوٰۃ میں تو یہی مذکورہ مساوات لکھی جو ڈاکٹر صاحب نے بھی لکھی ہے۔ اور کتاب الاضحیہ میں بیس دینار' سات تولے کے مساوی اور دوسو درہم' ستاون روپئے کے مساوی لکھا ہے۔

درالمختار میں ہے کہ پانچ دانہ جو کا ایک قیراط' ۱۴ قیراط کا ایک درہم اور ۲۰ قیراط کا ایک مثقال ہوتا ہے۔ گویا ایک درہم ۷۰ دانہ جو کے اور ایک مثقال ۱۰۰ دانہ جو کے مساوی ہے۔

ہمارے مروجہ اوزان' رتی' ماشہ اور تولہ ہیں۔ عموماً تین دانہ جو کی ایک رتی' ۸ رتی کا ایک ماشہ اور ۱۲ ماشہ کا ایک تولہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ایک درہم شرعی دو ماشہ 7.1/3 رتی کے مساوی ہے۔ اور ایک مثقال چار ماشہ' 1.1/3 رتی کے برابر ہے۔ لہذا بیس دینار چھ تولے ۱۱ ماشے 2.2/3 رتی کے۔ اور دوسو درہم ۴۸ تولے ۱۰ ماشہ 2.1/3 رتی کے مساوی ہوئے۔

سہولت کے خیال سے کسرات پورے کر لئے جائیں تو ۲۰ دینار کے ۷ تولے اور ۲۰۰ درہم کے ۴۹ تولے ہوئے واللہ اعلم فقط

☆☆☆☆☆